دارالمصنّفین

کی

ادبی خدمات کا تعارف

(۱۹۸۰ء تک)

ڈاکٹر شباب الدین

صدر شعبۂ اردو

شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج، اعظم گڑھ۔ (یوپی)

دارالمصنّفین

کی

ادبی خدمات کا تعارف

(۱۹۸۰ء تک)

ڈاکٹر شباب الدین

صدر شعبۂ اردو

شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج، اعظم گڑھ۔ (یوپی)

نام کتاب : دارالمصنفین کی ادبی خدمات کا تعارف (۱۹۸۰ء تک)

مصنف : ڈاکٹر شباب الدین

باراول : ۲۰۰۸ء

تعداد : پانچ سو (۵۰۰)

ناشر : ڈاکٹر شباب الدین

۱۸۰- بارہ دری، راجہ کا قلعہ، اعظم گڑھ۔ (یوپی) ۲۷۶۰۰۱

قیمت : Rs. 200/-

کمپوزنگ : صلاح الدین نثار (معروفی کمپیوٹر)

اعظم گڑھ Mo.9889036799

مطبع : اصیلہ آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔

تقسیم کار

۱- ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔

۲- فلاحی بکڈپو، مسافر خانہ روڈ، تکیہ، اعظم گڑھ۔

۳- شمیم بکڈپو، ٹیکسی اسٹینڈ، سرائے میر، اعظم گڑھ۔

۴- فہیم بکڈپو، ریحان مارکیٹ، صدر چوک، مئوناتھ بھنجن۔

انتساب

اپنے

بڑے بھائی

جناب شہاب الدین اعظمی صاحب

کے نام

جن کی ابتدائی تربیت نے مجھ کو

زندگی کا شعور بخشا

☆

کتب خانہ

قومی ومذہبی ضروریات میں جس قدر قومی مدرسہ، ایک قومی کالج، ایک قومی یونیورسٹی کی ضرورت ہے، اسی قدر ایک کتب خانہ اعظم کی بھی ضرورت ہے۔ اگر مسلمانوں کے مذہب، مسلمانوں کے علوم، مسلمانوں کی قومی تاریخ کو زندہ رکھنا ہے تو ضرور ہے کہ ایک ایسا کتب خانہ بہم کیا جائے جس میں علوم مذہبی کے متعلق نادر اور بیش بہا تصانیف موجود ہوں، جس میں مسلمانوں کے خاص ایجاد کردہ علوم وفنون کا کافی سرمایہ ہو، جس میں ہر فن کے متعلق وہ تمام کتابیں موجود ہوں جو اس فن کے دور ترقی کے مدارج ہیں، جس میں قدماء کے عہد کی یادگاریں ہوں اور ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ یہ کتب خانہ کسی کا ذاتی نہ ہو، بلکہ وقف عام ہو تاکہ تمام ہندوستان کے مسلمان اور بالخصوص مصنفین اور اہل قلم اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

علامہ شبلی نعمانی رح

ترتیب

صفحات

دارالمصنّفین

دارالمصنّفین اعظم گڑھ ایک سراج منیر ہے، جس کے ساتھ مجھے کئی رشتوں سے وابستہ ہونے کا شرف حاصل ہے، مجھے یہ ادارہ جو قوم کی بیش بہا دولت ہے دل سے عزیز ہے۔

دارالمصنّفین کے مؤسس روحانی مولانا شبلی نعمانی کی گراں قدر علمی و ادبی خدمات نے بلاواسطہ ہندوستان کے اور بالواسطہ ساری دنیا کے تہذیبی سرمائے میں قابل قدر اضافہ کیا ہے، علامہ شبلی اور دارالمصنّفین کا علمی و ادبی عطیہ زیادہ تر اسلامی تاریخ وسیر، تاریخِ ہند اور تاریخ و تنقید اور ادب کے میدانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی خصوصیت میں نفس مضمون کی معروضیت، لہجے کے اعتدال، زبان و بیان کی سلاست کے علاوہ اوران سے بھی زیادہ نمایاں قلب و نظر کی وسعت ہے، اس مکتب کے مصنفوں نے جہاں کہیں اسلامی تہذیب کے تعلقات یونانی، ایرانی، ہندی تہذیب سے دکھائے ہیں وہاں فصل کے بجائے وصل کے پہلو کو ابھارا ہے اور ''قصہ سکندر و دارا'' سنانے پر'' حکایت مہر و وفا'' بیان کرنے کو ترجیح دی ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین

سابق صدر جمہوریہ ہند

عرض حال

دارالمصنفین اعظم گڑھ کا شمار ہندوستان کے انتہائی اہم علمی اداروں میں ہوتا ہے، یہ ادارہ صرف علامہ شبلی مرحوم کے خوابوں کی تعبیر ہی نہیں بلکہ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کی علمی کاوشوں اور مولانا مسعود علی ندوی کی عملی جدوجہد کی زندہ تصویر بھی ہے، ۱۹۱۵ء میں جب اس کی تاسیس ہوئی تو مسلمانوں کا ایسا کوئی دوسرا ادارہ پورے ہندوستان میں موجود نہ تھا، اپنی تاسیس کے بعد اس ادارے نے جس طرح مصنفین کی متعدد نسلوں کی تربیت کی اس کو بھی اس کی انفرادیت اور اولیت میں شمار کرنا چاہئے۔

شبلی کے عہد حیات کا المیہ یہ تھا کہ مسلمانوں کا اقتدار ختم ہوئے ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا، ۱۸۵۷ء کے واقعات اور حادثات نے مسلمانوں کو جو زخم لگائے تھے ان کی یاد ابھی ذہنوں میں تازہ تھی، مزید برآں اپنی حکومت کے زعم میں عیسائی مبلغین کی دریدہ ذہنی بڑھتی جارہی تھی، وہ لوگ مسلمانوں اور اسلام پر ہر طرح کے ناروا اور بے بنیاد حملے کرتے، ان مبلغین سے نبرد آزما ہونے کے لئے مختلف حضرات سامنے آئے، جن میں مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور ڈاکٹر وزیر خاں کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے، عین اسی زمانے میں آریہ سماجی فتنے نے بھی پر پرزے نکالنے شروع کئے، خاص طور سے دیانند سرسوتی نے تو اسلام کی مخالفت کو اپنی زندگی کا مشن بنالیا تھا، اس فتنے کا سد باب کرنے کے لئے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ میدان عمل میں آگے آئے اور پوری پامردی سے اس فتنہ کے خلاف ڈٹ کر کھڑے ہوگئے، ابھی مسلمان ان دو محاذوں کو پوری طرح فتح نہ کرپائے تھے کہ یورپی علوم وفنون کی شکل میں ایک تیسرا خطرہ نمودار ہوا جس نے انگریزی خواں مسلمانوں کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لیا کہ اس کی آب وتاب سے ان کی نگاہیں خیرہ ہوکر رہ

گئیں اور وہ اپنے علوم وفنون کی ساری تابانیوں کو بھلا بیٹھے، نئے نئے سائنسی علوم نے مسلمانوں کے مذہبی مسلمات کو چیلنج کرنا شروع کر دیا، اس چیلنج سے صرف وہی مسلمان علماء عہدہ برآ ہو سکتے تھے جو اپنے قدیم علوم پر ماہرانہ دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ پر بھی محرمانہ نظر رکھتے ہوں، اس زمانے میں اس طرح کے علماء ناپید تھے، اس لئے نیم علماء کو میدان کارزار میں آنا پڑا اور وہ اپنے مذہب کے دفاع میں جو کچھ کر سکتے تھے کرنے میں مصروف ہو گئے، انگریزوں نے ایک حکمت عملی اور اختیار کر رکھی تھی وہ پوری محنت اور انہماک کے ساتھ عربی زبان کو سیکھتے اور اسلامی علوم وفنون، تاریخ اور تہذیب وتمدن کا مطالعہ کر کے ان کو اس انداز سے پیش کرتے کہ مسلمانوں کا ہر ہنر عیب بن کر نمایاں ہوتا، مولانا شبلی نے ایسے پڑھے لکھے اور جانفشانی ومحنت کرنے والے انگریز مصنفین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کے سد باب کے لئے قلم اٹھایا اور ان کے خیالات کے بطلان کے لئے انتہائی تحقیق وتدقیق، محنت وجانفشانی اور مدلل علمی انداز کے مقالات اور کتابیں لکھنے اور شائع کرنے کا منصوبہ بنایا، ان کے اس منصوبہ میں سب سے اعلیٰ مقام مذہب اسلام کو حاصل تھا، چنانچہ ان کی ساری تصانیف اسی محور کے گرد گھومتی ہیں، وہ جب تک زندہ رہے اسی مقصد کو اپنے سینہ سے لگائے رہے، یہ ایک ایسا کام تھا جس کو انجام دینے کے لئے تربیت یافتہ علماء کی ایک جماعت کا ہونا ضروری تھا، اسی لئے علامہ شبلی نے اپنی زندگی کا ایک مشن یہ بھی قرار دیا کہ وہ علماء کی ایک ایسی جماعت کی تربیت بھی کریں جو ان کے بعد ان کے بنائے ہوئے خاکہ میں رنگ بھرتی رہے اور مسلمانوں پر جو سہ طرفی حملے ہو رہے ہین ان کا ازالہ کرتی رہے، ان کے انتقال کے بعد ان کی یادگار دارالمصنفین نے بھی اسی مقصد کی آبیاری کا بیڑا اٹھایا اور اپنے کاموں کا آغاز انہی موضوعات کے مطالعے سے کیا جو علامہ شبلی کے محبوب اور پسندیدہ تھے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ دارالمصنفین سے پہلے بھی مذہبی لٹریچر اردو میں موجود تھا، مگر جس منظم منصوبے اور معروضی مطالعے کے ساتھ اس نوع کا لٹریچر دارالمصنفین سے شائع ہوا بلا شبہ اس کا شمار اس کی اولیات میں ہونا چاہئے، مذہبی علوم کے علاوہ عقلی علوم کا سرمایہ اس وقت تک اردو زبان میں نہ ہونے کے برابر تھا، دارالمصنفین نے اپنے قیام کے ابتدائی زمانے میں عقلی علوم کی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے اس موضوع پر بھی ایک منصوبہ کے تحت بلند پایہ تصانیف شائع کیں، جن سے

اردو زبان کے سرمایہ میں ایک وقیع اضافہ ہوا، افسوس ہے کہ ایک عرصہ تک یہ مفید سلسلہ برقرار رہنے کے بعد اب بعض نامعلوم وجوہ کی بنا پر ترک ہو چکا ہے۔

مذہبی اور عقلی علوم کے پہلو بہ پہلو ادبیات کے مطالعے کو بھی دارالمصنّفین نے وقت کی ایک اہم ضرورت سمجھا اور اس کام کی بھی داغ بیل ڈالی، دارالمصنّفین نے علامہ شبلی کے تنقیدی نظریات کو مشعل راہ بنایا اور اسی کی روشنی میں شعرالہند اور اقبال کامل جیسی کتابیں لکھی گئیں جو آج بھی اردو ادب کا گرانقدر سرمایہ ہیں۔

دارالمصنّفین کی تاسیس کو ترانوے سال ہو چکے ہیں، ان ترانوے سالوں میں زمانہ کہیں سے کہیں پہنچ چکا ہے، نئے نئے علوم کے ساتھ نئے نئے مسائل بھی سامنے آئے ہیں، جدید اور جدید تر علمی اور ادبی انکشافات بھی ہوئے ہیں اور ادبیات کے تقاضوں میں بھی خاصی تبدیلی واقع ہو چکی ہے، دارالمصنّفین نے اپنے آپ کو وقت کے ساتھ تیزی سے بدلنے کی کوشش نہیں کی، جس کی وجہ سے ایک عرصہ ہوا اس کی ادبی سیادت اس کے ہاتھوں سے جاتی رہی، لیکن علمی سیادت اب بھی اس کے ہاتھوں میں موجود ہے، خدا نگاہ بد سے محفوظ رکھے۔

''دارالمصنّفین کی ادبی خدمات کا تعارف'' دراصل میرا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ نے مجھ کو ماسٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض فرمائی، اسی مقالہ کو ضروری ترمیم و اضافہ کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے، جو تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں دارالمصنّفین کے قیام کی مختصر تاریخ مستند ترین مآخذ سے لکھی گئی ہے، ان صفحات کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ اس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکے کہ قطرہ کو گہر بننے کے لئے کن کن مراحل سے گزرنا پڑا۔

دوسرے باب میں دارالمصنّفین کی ان ادبی تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے جن کا موضوع اردو ادبیات ہے، شعبۂ اردو کی رعایت سے ہم نے ان کتابوں کے مطالعے سے صرف نظر کیا ہے جن کا تعلق فارسی ادبیات سے ہے، یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر کوئی فارسی ادب کا اسکالر ہی کام کر سکے گا، علاوہ بریں اس مطالعے میں علامہ شبلی کے ادبی جانشین اور دارالمصنّفین کے رکن اعظم مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کی تصانیف کا جائزہ نہیں لیا گیا ہے، کیوں کہ اس موضوع پر راقم الحروف کی کتاب ''عبدالسلام ندوی کی ادبی خدمات'' پہلے ہی زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر

آ چکی ہے، ہم نے اس باب میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ ہر کتاب کو اس کے زمانہ تحریر کے تناظر میں جانچا اور پرکھا جائے اور جو کتاب جس زمانے میں شائع ہوئی ہے اسی زمانے کے مروجہ تنقیدی اصول ونظریات کے مطابق اس کی قدر و قیمت کا جائزہ لیا جائے۔

تیسرے باب میں دارالمصنفین کے ترجمان ''معارف'' کا قدرے تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے ہم نے اپنی آسانی کے لئے اس کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے، پہلا دور سید سلیمان ندوی مرحوم کے عہد ادارت کا احاطہ کرتا ہے، دوسرا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کے اور تیسرا دور سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کے عہد ادارت پر محیط ہے۔اس باب میں ہم نے یہ دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے کہ معارف کی اولیات کیا کیا ہے؟ ان اولیات پر وہ کب تک قائم رہا اور ادارتوں کی تبدیلیوں سے اس میں کیا کیا تبدیلیاں آئیں؟

شبلی اور رفقائے دارالمصنفین کی کئی اہم ادبی تصانیف ایسی بھی ہیں جو دارالمصنفین سے شائع نہیں ہوئی ہیں، دارالمصنفین کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ہم کو ان تصانیف سے صرف نظر کرنا پڑا ہے اور ہم نے اپنے آپ کو صرف ان تصانیف تک محدود رکھا ہے جن کی اشاعت دارالمصنفین سے ہوئی ہے۔

یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ پاتا اگر مجھے اپنے استاد محترم پروفیسر مسعود عالم صاحب کی رہنمائی حاصل نہ ہوتی، اس کے لئے میں ان کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں، مربیٔ علم وادب پروفیسر کبیر احمد جائسی صاحب کا شکریہ ادا کرنا اپنا خوشگوار فریضہ سمجھتا ہوں، محترم جائسی صاحب نے اس کتاب کی تیاری میں میری علمی مدد فرمائی اور اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازا، اس موقع پر پروفیسر عبدالحق صاحب کی محبت وشفقت کا اعتراف ضروری ہے، عبدالحق صاحب میرے لئے بے پناہ زحمتیں اٹھاتے ہیں اور بے مزہ نہیں ہوتے اس کے لئے میں ہمیشہ ان کا احسان مند رہوں گا۔ اپنے کالج کے پرنسپل ڈاکٹر افتخار احمد صاحب کا شکریہ ادا کرنا لازمی ہے کہ انھوں نے شعبۂ اردو کو ہر طرح کی سہولتیں فراہم کر کے مجھے بہت سی الجھنوں سے محفوظ کر دیا، اپنے بڑے بھائی جناب صلاح الدین اعظمی صاحب کا بے حد ممنون ہوں جن کی بے لوث اور مشفقانہ سرپرستی نے مجھے کبھی غم دوراں کا احساس نہیں ہونے دیا، ڈاکٹر شوکت علی خاں صاحب، ڈاکٹر عشرت فیروز صاحب اور ڈاکٹر ابوسعد

اصلاحی صاحب کا ذکر نہ کرنا بڑی ناسپاسی ہوگی کہ ان حضرات کی دست گیری زندگی کے ہر موڑ پر میرے بہت کام آئی، میں ان کا شکر گزار ہوں۔

میرے قابل احترام رفقائے کار ڈاکٹر فخر الاسلام صاحب ، ڈاکٹر علاء الدین خاں صاحب، ڈاکٹر محی الدین آزاد صاحب، ڈاکٹر حکیم الدین صاحب، کلیم احمد صاحب، سرفراز نواز صاحب، عقیل احمد صاحب اور عزیزی ریحان راشد وغیرہ نے قدم قدم پر اپنے قیمتی تعاون سے نوازا اور اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود اپنا قیمتی وقت مجھے عنایت فرمایا، ان کے شکریہ کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں، ان کے خلوص کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے، لفظوں میں ڈھالا نہیں جا سکتا۔

ڈاکٹر شباب الدین

(صدر شعبۂ اردو)

شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج

اعظم گڑھ

شباب ——— میرا بھائی

شخص اور شخصیت ——— ایک تعارف

ڈاکٹر ابو سعد اصلاحی ☆

مجھے پڑھنے لکھنے کا شوق نہ پہلے تھا نہ اب ہے، درسیات سے وحشت پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے ——— مگر علی گڑھ میں ٹھہرنے کی خواہش پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے، وہی بچوں کی معصومیت وہی دن میں جگنو پکڑنے کی ضد ——— اصلاح میں عربی چہارم پنجم کا طالب علم تھا، اس زمانے میں خارجی مطالعے کا کسی حد تک شوق تھا، دار المعلومات (طلبا کی لائبریری) میں ادب کا رجسٹر کھنگال رہا تھا، اچانک نگاہ رشید احمد صدیقی کی مشہور آپ بیتی ''آشفتہ بیانی میری'' پر ٹھہر گئی، نام کی لذت نے کتاب پڑھنے پر مجبور کر دیا، کتاب کو ہاتھ لگایا تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے جملے، آبشار کی طرح بہتی ہوئی تحریر، بات کہنے کا ڈھنگ اور بات بھی علی گڑھ کی ''ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا'' میں تحریر سے بے حد متاثر ہوا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں اس سے پہلے بہت کچھ پڑھا تھا جس کا ماحصل یہ تھا کہ یہ ادارہ سرسید کی فکری کاوش کا مظہر ہے اور مسلمانوں کی علمی ترقی کے لئے قائم کیا گیا ہے، یہ ایک قانونی سا، موہوم سا تصور تھا جو ذہن کے کسی گوشے میں دبا دبا سا تھا لیکن رشید صاحب نے ''آشفتہ بیانی میری'' میں جس علی گڑھ سے تعارف کروایا اور مسلمانوں کی جس تہذیبی شناخت کی نشاندہی کی اسے دیکھنے کا شدید اشتیاق پیدا ہوا، نظری طور پر علی گڑھ سے باقاعدہ شناسائی پہلی مرتبہ ہوئی تھی۔

الاصلاح کے بعد شہادت گہ الفت میں قدم رکھا اور رشید صاحب کا علی گڑھ ڈھونڈنے لگا

☆ میڈیکل آفیسر لکھنؤ۔

جو بات عرصے سے لباس آرزو میں تھی، طبیعت اس کی تکمیل چاہتی تھی، مایوسیاں بڑھتی جارہی تھیں، اسی دوران ملاقات ارشاد مرحوم (۱) سے ہوگئی، یہ میرے کلاس فیلو تھے۔ ملاقات دوستی میں بدل گئی، ایک دن میں نے ان سے برسبیل تذکرہ کہا کہ علی گڑھ میں ''وہ کچھ'' نہیں رہا جو کبھی تھا، میری بات سمجھ گئے اور کہنے لگے، علی گڑھ اس دیوار اور اس بھیڑ کا نام نہیں ہے، ایک تہذیبی شناخت کا نام ہے۔ میں نے کہا، کہنے سننے کی حد تک اس جملے میں بڑا حسن ہے مگر اسے برتنے میں، اسے پانے میں یا اسے چھو لینے میں بڑی مشکل ہے، انھوں نے کہا: نہیں ایسا نہیں ہے، چلو تمہیں آج ایک شخص سے ملاتا ہوں، شاید تم علی گڑھ کے افسانوی تخیل کی عملی تصویر دیکھ سکو، شام کو ہم دونوں دی، ایم ہال کی طرف چل پڑے۔ نصر اللہ ہاسٹل روم نمبر ۱۰ میں ایک بھیڑ سی نظر آئی، مجمع پر طائرانہ نگاہ دوڑائی تو ایک ''دشمن ایمان وآگہی'' سی شخصیت پر نگاہ ٹھہر گئی، میر محفل وہی شخص تھا اور ہماری ملاقات کا نشانہ بھی، مصافحہ کے لئے دونوں طرف سے ہاتھ بڑھے، سمت مخالف سے ایک تبسم ریز لفظ نکلا ''شباب'' اور زمین پر پھولوں کا ڈھیر لگ گیا، میرا کام ہوگیا تھا، میں پھولوں کے حسن اور خوشبو میں کھو گیا تھا، ارشاد مرحوم سے شباب کا تعلق پرانا بھی تھا اور دوستانہ بھی، یارانے کا تقاضا تھا کہ روئے سخن دوست کی طرف کیا جائے، میں شباب کی گفتگو سن رہا تھا اور دل ہی دل میں مصرعہ کا لطف لے رہا تھا۔

''رنگ باتیں کرے اور باتوں سے خوشبو آئے''

پرتمکنت لہجہ، نکھری ہوئی زبان، شستہ انداز بیان، ٹھہرا ٹھہرا طرز تکلم اور بوقت ضرورت ہلکا ہلکا تبسم اگر ایک طرف طبیعت کے بانکپن کا پتہ دے رہا تھا تو دوسری طرف چوڑی چکلی پیشانی پر ابرو سے ذرا اوپر کی شکنیں شخصیت کے تحیر خیز تفکر کی عکاسی کررہی تھیں۔ اچھے شخص کی اچھی باتوں سے میری جھولی بھر گئی تھی۔ توجہ ادھر بھی ہوئی، رسمی سی نہیں، سراپا خلوص کے ساتھ۔

میں سوال سے کچھ زیادہ ہی جواب دینے کی کوشش کررہا تھا، انسان کی نفسیات ہوتی ہے

---

(۱) ارشاد بھائی کے ساتھ مرحوم کا لفظ لکھتے ہوئے کلیجہ منھ کو آتا ہے، ابھی بی، یو، ایم، ایس سال دوم کے طالب علم ہی تھے کہ طغیانی پر آئی ہوئی ندی کی بے رحم لہروں نے انھیں نگل لیا، دنیا میں اچھے لوگ بھی کم ہوتے ہیں اور ان کی عمریں بھی کم ہوتی ہیں۔

کہ وہ اپنی من پسند شخصیت سے گفتگو کو طول دینا چاہتا ہے۔ اس وقت میں اسی نفسیات کا گزیدہ تھا، ہم جانے کے لئے اُٹھے، اس لئے کہ آستان سے تو اُٹھنا ہی تھا اور دل کا عالم بقول میر؀

یوں اٹھے آہ اس کی محفل سے
جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے

شباب نے ہمیں تنہا نہیں چھوڑا، شیروانی پہنی اور چائے خانے تک ایک جم غفیر کے ساتھ چل پڑے، میں نے پہلی مرتبہ شیروانی میں اُن کا سراپا دیکھا تھا۔ ارشاد مرحوم سے کہا، انسان آسمان سے تقدیر ہی نہیں لے کر آتا بلکہ لباس بھی لے کر آتا ہے، شباب بھائی پر شیروانی ہی نازل ہوئی ہے، انھیں شیروانی میں ملبوس دیکھ کر کتنوں کو شیروانی پہننے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ میرے چھوٹے بھائی شبو نے پہلی مرتبہ شباب بھائی کو دیکھا تو کہنے لگا کہ شباب بھائی پر شیروانی بہت اچھی لگتی ہے، میں نے کہا، ہاں، لباس ان کو نہیں وہ لباس کو حسن بخشتے ہیں۔ ویسے تم تو زوال آمادہ ''شباب'' کو دیکھ رہے ہو۔ کاش دس سال پہلے شباب آمادہ ''شباب'' کو دیکھا ہوتا، مزید برآں یہ بھی کہ شیروانی اچھی لگنے کا سبب اگر ایک طرف ان کا جسمانی حسن ہے تو دوسری طرف اخلاقی حسن بھی۔ کسی حماسی شاعر نے بڑے پتے کی بات کہی ہے؀

إذا المَرءُ لم يَدنَس من اللؤم عرضه
فكل رداء يرتديه جميلٌ

[انسان کی فطرت میں کمینہ پن نہ ہو تو جو چادر بھی اوڑھ لے اچھی لگتی ہے۔]

شباب کا باطن آئینے کی طرح صاف ہے جس کی عکس ریزی سے ان کی شخصیت ہمیشہ منور رہتی ہے۔

چائے پی کر رخصت ہوئے تو میں نے ارشاد مرحوم سے چھوٹتے ہی کہا، بڑا با اخلاق شخص ہے، کیا سب سے اسی طرح ملتا ہے، کہنے لگے ہاں۔ میں اداس ہو گیا۔ میں نے کہا پھر تو یہ شخص ''خرچ'' ہو جائے گا۔ ارشاد نے کہا: اخلاق اور علم خرچ کرنے سے گھٹتے نہیں بڑھتے ہیں۔ وہ مجھے فلسفہ پڑھا رہے تھے، ایک ازلی سچائی کا درس دے رہے تھے اور میری نگاہ عواقب پر تھی، آج بھی جب شباب سے ملتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ مرحوم کی بات میں کتنی سچائی تھی ——— پہلی ملاقات کے

بعد ملاقاتیں ہوتی رہیں اور مراسم خاصے گہرے ہوتے گئے۔

تعلیم و تعلم کے ساتھ ساتھ شباب کی شخصیت پر سیاسی وسماجی دلچسپیوں کی بھی خاصی چھاپ تھی، شباب کی سیاسی وسماجی سرگرمیاں صرف یونیورسٹی کیمپس (Campus) تک ہی محدود نہیں تھیں، وہ دور طالب علمی ہی میں ملک کی عملی سیاست میں حصہ لینے لگے تھے، مشہور سیاسی مدبر جناب ہیم وتی نندن بہوگنا صاحب سے ان کے مراسم بڑے گہرے تھے، جن چند نوجوانوں کے ساتھ ان کی سنجیدگی طبع کی بنیاد پر بہوگنا جی مشفقانہ برتاؤ کرتے تھے، ان میں سے ایک شباب بھائی بھی تھے، اس جوڑ توڑ کی سیاست میں بھی شباب نے ہمیشہ پیشہ ورانہ اور مصلحت آمیز سیاسی آلودگی سے اپنے دامن کو بچائے رکھا۔

اوائل عمری ہی میں ملک وملت کے حالات ان کے مضراب دل کو چھیڑنے لگے، چنانچہ دل دردمند نے قوم کی فلاح و بہبود کے لئے بی۔ اے سال ہی میں اعظم گڑھ کے ایک پسماندہ علاقہ میں ایک جونیر ہائی اسکول قائم کرنے پر مجبور کردیا، ظاہر ہے یہ وہ عمر ہے جب لوگ دیوار دبستان پر لام الف لکھا کرتے ہیں، اس اسکول کے وہ ۸۲ء تک منیجر بھی رہے۔

وہ دن بھی آیا کہ یونین کے لئے سکریٹری کے امیدوار کی حیثیت سے شباب میدان میں آگئے، اس سے قبل ممبر کابینہ کی حیثیت سے یونین میں طلبا کی نمائندگی کرچکے تھے، الکشن پورے وثوق اور پورے روایتی انداز میں لڑا گیا لیکن ہمارا امیدوار ہار گیا، (شکست کے بہت سارے خارجی اسباب تھے) شباب کی شکست، شکست دل کا سبب بن گئی، دل رنجور کی محزونیاں بڑھ گئیں، زندگی کے المیہ میں اضافہ ہوگیا۔ زندگی کی ہر خواہش کی طرح میری یہ خواہش بھی پوری نہ ہوسکی، لیکن اس کا اثر شباب پر یا تو بالکل نہیں تھا یا غم انگیزی کے فطری ملکہ کی بدولت وہ مسکرا رہے تھے۔ چاہنے والوں کو تسلیاں دے رہے تھے، ان کی فطرت کا یہ غیر معمولی خاصہ ہے کہ وہ ہر غم کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرلیتے ہیں، شرط یہ ہے کہ بات توہین انا تک نہ پہنچے ـــــ غم واندوہ کو چھپا کر مسکرانے کا جتنا ملکہ شباب کو حاصل ہے شاید ہی کسی کو ہو یہ ان کے چاہنے والے جانتے ہیں کہ ہر وقت ہنس ہنس کر باتیں کرنا غموں کو چھپانے کی ایک کوشش ہے جس میں بظاہر وہ اب تک کامیاب نظر آرہے ہیں۔

تم اتنا جو مسکرا رہے ہو
کیا غم ہے جسے چھپا رہے ہو

۸۰ء کے زمانے میں علی گڑھ کے سیاسی افق پر شباب آفتاب و ماہتاب بن کر چمک رہے تھے، حاجت مندوں کی ایک بھیڑ، آپ کے ساتھ چلتی تھی، میرے دوست خلیق اصلاحی کے داخلے میں مشکل پیش آرہی تھی، تذکرہ شباب بھائی سے کر بیٹھا۔ اب میرا نہیں اُن کا مسئلہ تھا۔ کیس کی پیروی کے لئے میں بھی ایک روز صبح سویرے آستانے پر حاضر ہوا، دیکھا تو ایک بھیڑ تھی جو کسی نہ کسی مشکل کا حل چاہتی تھی، حسب روایت مجھ سے بھی خندہ پیشانی سے ملے، میں نے اظہار مدعا کیا تو چہرے کا رنگ ایسا بدل گیا جیسے دھوپ پر سایہ پڑ گیا ہو، جبیں شکن آلودہ ہوگئی، مجھے تنہائی میں لے گئے اور محبت سے ڈانٹتے ہوئے کہا خدارا آپ خود کو اس بھیڑ میں شامل نہ کریں۔ مجھ پر بھروسہ کریں میں معذرت کر کے چلا آیا۔ انھیں کی کوششوں سے داخلہ ہوگیا، خلیق ایم۔اے کر کے جانے لگا تو میں نے اس کو الوداعیہ دیا، ہم سب کے سرپرست ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی صاحب محفل کی صدارت کر رہے تھے، جذبۂ احسان مندی سے مجبور ہو کر میں نے باتوں باتوں میں شباب کے اس احسان کا تذکرہ کر دیا، شباب کے دل کا تار تھرا گیا، آبدیدہ ہوگئے بلکہ خفا بھی —— میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ کوئی محسن کو کچھ دیتا نہیں لیکن محسن کے تئیں اگر احساس ممنونیت ہی باقی ہے تو بہت ہے، اخلاقی بلندی کا یہ عالم کہ شباب پر یہ ذکر بھی ناگوار خاطر ہوگیا، ایسے لوگ کہاں ملیں گے جنھیں اپنے احسان کا ذکر بھی بار خاطر ہو —— دنیا تو نہ صرف احسان جتاتی ہے بلکہ اس کا صلہ بھی چاہتی ہے، شباب کسی شخص کا نہیں خلوص و محبت کی معنویت کا نام ہے۔

علی گڑھ نہ شباب کو چھوڑنا چاہتا تھا اور نہ شباب علی گڑھ کی فضا سے ہٹ کر کہیں اور قوت پرواز آزمانا چاہتے تھے، تعلیم و تعلم کا سلسلہ تو ایک دن ٹوٹنا ہی تھا جو ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حصول کے بعد بالآخر ٹوٹ گیا۔

درسیاتی زندگی سے رسمی تعلق ٹوٹنے کے بعد حصار ذہن میں محبوس جودتِ طبع اور جولانی فکر کو ذریعۂ اظہار چاہیئے تھا، قلم آبشار کی طرح بہنا چاہتا تھا، خوش قسمتی سے شباب بھائی کو تہذیب الاخلاق کا پلیٹ فارم میسر آگیا، جذبات کی ترسیل اور احساسات کے ابلاغ کے لئے تہذیب

الاخلاق ایک بہتر وسیلہ ثابت ہوا، شباب بھائی ۸۶ء سے ۱۹۹۲ء تک بحیثیت جوائنٹ ایڈیٹر تہذیب الاخلاق سے منسلک رہے، اس کے بعد —— زندگی کے جبر نے شباب کو شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج کے شعبۂ اردو سے وابستہ کردیا۔ شبلی کالج کو ایک اچھا استاذ اور ایک اچھا انسان مل گیا، مگر شباب کی زندگی کا یہی سب سے زیادہ Crucial point تھا —— پانے کے بھی یہی دن تھے، گنوانے کے بھی یہی دن تھے۔ سنبھلنے کے بھی یہی دن تھے، لڑکھڑانے کے بھی یہی دن تھے۔ سب کچھ منحصر تھا شباب کی زندگی کرنے کے ہنر پر —— یہ کوچ کوچۂ یار سے سوئے دار کی طرف تھی۔ بڑی جگہ سے چھوٹی جگہ آکر طبیعت عام طور پر سکڑ جاتی ہے، ذہن ٹھس ہوجاتا ہے، سوچ کے چشمے منجمد ہوجاتے ہیں، قوت وتوانائی میں ٹھہراپن اور اضمحلال پیدا ہوجاتا ہے، شخصیت کا سارا بانکپن معاشرتی جمود اور سماجی تعطل کی نذر ہوجاتا ہے، اسی بانکپن اور تشخص کے جلال وجمال کو بچانا ہی اصل کمال ہوتا ہے، اور یہی کمال شباب بھائی نے کردکھایا ہے، انھوں نے شبلی کالج کی فضا اپنے لئے ہموار کرلی، یہاں پر انھوں نے عذاب وحشتِ جاں کی تہذیب میں کامیابی حاصل کی۔ میرے نزدیک اس کامیابی کا سب سے بڑا راز شباب کی طبیعت کا احتجاج ہے، جو احتجاج کبھی متشددانہ، آتش بار، یا غضبناک صورت اختیار نہیں کرتا بلکہ یہ ایک محبت کرنے والے کا احتجاج ہوتا ہے، درد آمیز، مخلصانہ اور ہمدردانہ —— شباب کی زندگی کے احتجاجی شعور اور معاشرہ کی کرب آمیز آگہی نے اعظم گڑھ میں نئی تڑپ اور نئی تاثیر پیدا کرلی ہے، اسی تاثیر کی وجہ سے انھوں نے زندگی کے میدان میں خواہ خالص علمی ہو یا سماجی —— کامیابی حاصل کی۔

شباب کی ادبی شخصیت کے رچاؤ میں میرے خیال کے مطابق شبلی، مولانا عبدالسلام ندوی، سید سلیمان ندوی اور خلیل الرحمٰن اعظمی کا خاصہ حصہ ہے (مولانا عبدالسلام ندوی پر ان کا تحقیقی مقالہ بھی ہے) لیکن طبیعت کی حساسیت کی بناء پر شاید رشید احمد صدیقی اور فکر تونسوی کے اسلوب سے وہ خاصے متاثر ہیں، فکر کی فنکارانہ چابک دستی کا کمال یہ ہے کہ وہ معاشرے کی بھونڈی سے بھونڈی تصویر کی عکاسی اس انداز میں کرتا ہے کہ انسان تلملا کر بھی مسکراتا ہے، یہی چیز شباب کے مزاج سے میل کھاتی ہے، میں عرض کرچکا ہوں کہ بکھر کر مسکرانا شباب کا فن ہے وہ اکثر کہا کرتے کہ ہر دو جملے کے بعد طنز کے زہریلے ڈنک مارنا فکر کے لئے ضروری ہوتا ہے، شباب ڈنک مارتے نہیں

محسوس کرتے ہیں۔

شباب کا موضوع ادب ہے، علمی وادبی دنیا میں ان کے نام کو سند اعتبار حاصل ہے۔ چالیس سے زائد مقالات ملک کے مختلف رسائل وجرائد کی زینت بن چکے ہیں، ان کی تصنیفات میں مولانا عبدالسلام ندوی کی ادبی خدمات، کبیر احمد جائسی کی علمی وادبی خدمات اور ''کیفی'' علمی دنیا میں داد تحسین حاصل کر چکی ہیں، اس کے علاوہ شبلی کی معنویت، اکیسویں صدی میں زیر طباعت ہے۔

کسی تعلیمی ادارے کا انتظام وانصرام بڑا ہی صبر آزما کام ہوتا ہے لیکن شباب اس وادیٔ پرخار کے بھی مرد میدان ہیں، درس وتدریس کے ساتھ ساتھ اس وقت ابن سینا طبیہ کالج بینا پارہ و بینا پارہ انٹر کالج، بینا پارہ، اعظم گڑھ کے فعال منیجر، اتر پردیش اردو اکادمی اور دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کے ممبر بھی ہیں۔

گیہواں جاذب نظر رنگ، اوسط سے نکلتا ہوا ابھرا ابھرا جسم، کشادہ پیشانی اور پیشانی پر خم آلود شکنیں، آبدار ابرو، ستواں ناک، متبسم چہرہ، پیچھے کی طرف کنگھی کیے ہوئے بال اور نہایت صاف ستھری شیروانی میں ملبوس، اگر آپ کسی ایسے شخص کو دیکھیں جو اعظم گڑھ کی فضا میں رعنائی جمال کا اضافہ کر رہا ہو تو سمجھ لیں کہ میری تحریر کا انتساب اسی کی طرف ہے۔

یہ ہے شباب ''شخص اور شخصیت'' کا معمولی سا خاکہ، ادنیٰ سا تعارف ——— چند آڑی ترچھی لکیریں اور کچھ الٹے سیدھے الفاظ کے ذریعہ محض ایک منطقی تعارف ——— میرا دل کہہ رہا ہے کہ مجھ سے شباب بھائی کا تعارف ہو نہیں پایا ہے، اظہار عجز وانکساری کے بغیر یہ عرض کر دوں کہ گرچہ زبان وبیان کی تھوڑی بہت شدھ بدھ مجھے بھی ہے مگر پھر بھی الفاظ کے ذریعہ اس کج کلاہ سے شناسائی ادھوری سی ہے، ہاں اگر پھول اور ستارے زیب قرطاس کر کے کوئی خاکہ نگاری ممکن ہو پاتی تو شاید اس شباب سے ہم آشنا ہو پاتے جس کے ساتھ متبسم فضا میں چلنا وادیٔ محبت میں گلگشت فرمانے جیسا ہے۔

دارالمصنّفین کے قیام کا تاریخی پس منظر

انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر کا زمانہ ہندوستانی مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا زمانہ ہے، مغلیہ سلطنت کے زوال اور انگریزوں کے تسلط واقتدار کے بعد ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کو بڑی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ صورت حال بنیادی طور پر دو وجہ سے پیدا ہوئی تھی اول تو یہ کہ ملک کی حکومت انگریزوں نے مسلمانوں سے چھینی تھی اس لئے فطری طور پر وہ انھیں کو اپنا حریف اور سلطنت کا دعویدار سمجھتے تھے دوئم یہ کہ ۱۸۵۷ء کے انقلابی طوفان میں مسلمانوں نے ہندوستان کی دوسری قوموں سے کہیں زیادہ اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس لئے پوری ملت اسلامیہ سے انگریز حکمراں نہ صرف بدگمان تھے بلکہ نفرت بھی کرتے تھے بعض انگریز مصنفوں نے اسباب بغاوت پر مضامین لکھ کر اس شورش کا ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھہرایا اور مسلمانوں کے بارے میں ایسی رائیں ظاہر کیں جن کی وجہ سے انگریزوں کے دل ودماغ تعصب سے بھر گئے، انگریزوں کے اس تعصب کی ایک ہلکی سی جھلک مولانا حالی کی اس تحریر میں دیکھی جا سکتی ہے:

> ''مسلمانوں پر کہیں یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ ان کو بالذات اپنے مذہب کے بموجب عیسائیوں سے عداوت ہے۔ کوئی یہ لکھتا تھا کہ شاہ نعمت اللہ ولی کی پیشین گوئی سے تمام مسلمانوں کو یقین تھا کہ اب عیسائیوں کی عمل داری نہیں رہنے کی، اور سب سے بڑا اور عام الزام جو ان پر عائد کیا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے مذہب کی رو سے انگریزوں پر جہاد کرنا واجب تھا اور اس لئے مسلمان سب سے زیادہ بغاوت کے مرتکب ہوئے۔'' (۱)

اس طرح کی باتوں کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کے دلوں میں نفرت کے شعلے بھڑک اٹھے اور وہ انتقامی کارروائی پر اتر آئے، ان کے وجود کو مٹانے کے لئے اپنی ساری

توانائی صرف کرنے میں مصروف ہوئے، مسلمانوں پر ہر طرح کے مظالم ڈھائے گئے وہ قید و بندگی صعوبتوں سے دوچار کئے گئے اور ہزاروں افراد کو جن میں شاہی خاندان کے افراد بھی شامل تھے، تختۂ دار پر چڑھا دیا گیا، سروں کو کاٹ کر سرکاری عمارتوں اور پیڑوں پر لٹکا دیا گیا، ان کی جائداد اور جاگیروں کو ضبط کر لیا گیا، ان کے لئے سرکاری ملازمتوں کے دروازے تقریباً بند کر دئے گئے اور سرِراہ انھیں ذلیل و خوار کیا گیا، ظلم کی انتہا تو یہ تھی کہ بقول حالی:

> ''ہندوستانی خیرخواہیٔ سرکار کی آڑ میں مسلمانوں سے دل کھول کھول کر بدلے لے رہے تھے اور اگلے پچھلے بغض نکال رہے تھے، مسلمانوں کو مجرم قرار دینے کے لئے کوئی ثبوت درکار نہ تھا، ان کا مسلمان ہونا ہی ان کو مجرم ٹھہرانے کے لئے کافی تھا۔'' (۲)

دوسری طرف عیسائی مشنیریاں ان کے مذہب اور عقیدے پر حملہ آور تھیں، عیسائی مبلغین اسلام کی تصویر بگاڑ کر پیش کرتے اور اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے اس کے متعلق غلط اور بے بنیاد باتوں کا پروپیگنڈہ اس چابکدستی اور ہوشیاری سے کرتے کہ کم فہم لوگ شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتے، دراصل انگریزوں کی پالیسی یہ تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی اور مذہبی تشخص کو اس طرح پامال کر دیا جائے کہ وہ پھر سر اٹھانے کے قابل نہ رہ جائیں اور انگریزوں کے لئے حکمرانی کی راہ ہمیشہ کے لئے صاف اور ہموار ہو جائے، اس مقصد کے حصول کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ مسلمانوں کو ان کے مذہب سے بیگانہ کر دیا جائے نیز اسلامی اقدار اور ان کے اثرات کو یکسر ختم کر دیا جائے اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''یہ ایک سیاسی حربہ بھی تھا، کیوں کہ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے اثرات کو دور کرنے کے لئے اور اس کے دوبارہ وجود میں آنے کے امکانات کو ختم کرنے کے لئے بے حد ضروری سمجھا گیا تھا، تاکہ مسلمانوں کے دینی اور مذہبی احساس کو جہاں تک ممکن ہو مٹا دیا جائے، تاکہ دینی تنظیم کی ابتری کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی یکجہتی بھی ختم ہو جائے، بنابریں عیسائی مبلغوں کے سامنے اس صدی کا غالباً سب سے بڑا منصوبہ یہی تھا۔'' (۳)

عیسائی مشنیری کی سرگرمیوں کے باعث مذہبی مناظروں اور مباحثوں کا عام رواج ہوا، چنانچہ اس کا ایک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ہندوؤں میں بھی مذہبی احساس بیدار ہوا اور وہ بھی اپنے مذہب

کے متعلق تحقیق وجستجو کی طرف مائل ہوئے، بنگال میں راجہ رام موہن رائے نے سناتن دھرمی خیالات سے ہٹ کر ایک نیا خیال پیش کیا جس کے مطابق دنیا کے تمام مذاہب کو اصلاً ایک مذہب قرار دیا گیا، اس کے کچھ عرصہ بعد پنجاب میں سوامی دیانند نے ہندوؤں میں مذہبی بیداری پیدا کرنے کے لئے آریہ سماج کی تشکیل کی، آریہ سماج کے ارکان بڑے متحرک اور فعال تھے، انھوں نے گھوم گھوم کر اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کی، ہر جگہ اپنے سفیر اور واعظ پھیلا دئے، جو لوگوں کو یہ سمجھاتے تھے کہ ہندو مذہب اعلیٰ ترین اخلاقی اور روحانی اقدار کا سرچشمہ ہے، وید کے معنیٰ ومفہوم جو عام طور پر بیان کئے جاتے ہیں، وہ صحیح نہیں بلکہ اس کی صحیح ترجمانی وہی ہے جو سوامی دیانند کرتے ہیں، ان کی کوشش یہ تھی کہ کسی طور غیر تعلیم یافتہ افراد اور نومسلوں کو اپنے حلقۂ اثر میں لایا جائے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ اپنے مذہب کی خوبیوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب بالخصوص اسلام پر شدید نکتہ چینی بھی کرتے اور اسلامی تعلیمات کو مسخ کر کے پیش کرتے، آریہ سماجیوں کی اس فتنہ پرور تحریک کے سدباب کے لئے مولانا محمد قاسمؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ آگے آئے اور بڑے مدلل انداز میں ان کے اعتراضات اور اتہامات کے مسکت جوابات دئے اور ان کے فریب کی قلعی کھول کر رکھ دی۔

اس کے بعد ایک ایسا دور آیا کہ ہر طرف یورپی علوم وفنون کا غلغلہ بلند ہوا، مستشرقین نے اسلامی علوم کی کتابوں کو پڑھ کر اسلام کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا اور ملحدانہ خیالات کا بڑے دلنشیں انداز میں پروپیگنڈہ شروع کیا، ان خیالات کا اثر محض انگریزی خواں طبقہ ہی پر نہیں بلکہ تمام مسلمانوں پر واسطہ در واسطہ پڑنا شروع ہوا، بعض حضرات تو اس قدر متاثر ہوئے کہ مذہب کو خدائی قانون کے بجائے اخلاقی قانون سمجھنے لگے، اپنے مقصد کی حصول یابی کے لئے مستشرقین قرآن وحدیث اور مسلمانوں کی تاریخ وتمدن کا مطالعہ بڑی عرق ریزی سے کرتے اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے پرفریب دلائل پیش کرتے کہ خود مسلمانوں کی نظر میں اسلام کی وقعت اور اہمیت کم ہو جائے۔

غرض وہ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا بڑا پر آشوب دور تھا، ان کی جان، مال وعزت وآبرو، تہذیب وتمدن اور مذہب وعقیدے پر خطرات ومشکلات کے سیاہ بادل منڈلا رہے تھے، قوم کا شیرازہ بکھر رہا تھا، لوگوں کے دلوں میں مایوسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی، کسی میں کچھ کرنے کا حوصلہ

باقی نہیں رہا تھا، ہر طرف بے حسی، جمود اور شکست خوردگی کی کیفیت طاری تھی، ایسے عالم میں ضرورت تھی ایک ایسے مرد آہن کی جو لوگوں میں جوش، ہمت اور خود اعتمادی پیدا کر کے ان کو قعر مذلت سے نکال لائے اور قوم کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو پار لگائے، قدرت نے اس عظیم کام کی انجام دہی کے لئے سرسید احمد خاں کو منتخب کیا اور وہ مسلمانوں کے درمیان مسیحا بن کر آئے اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

سرسید بذات خود انگریزوں کی ظلم وزیادتی کے شکار ہوئے تھے اور بہت سے دل دہلا دینے والے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے، ان کی زندگی میں ایک گھڑی ایسی بھی آئی تھی جب وہ بھی حوصلہ ہار بیٹھے تھے اور حالات سے گھبرا کر ہندوستان سے رخت سفر باندھنے کا ارادہ بھی کر چکے تھے، سرسید کی اس کیفیت پر حالی نے ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

> ''تمام باتوں پر نظر کر کے اول اول تو سرسید کا جی چھوٹ گیا تھا، یہاں تک کہ انھوں نے ہندوستان سے کسی دوسرے اسلامی ملک میں جا کر بود باش کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا، مگر آخر کار ان کو وہ ارادہ فسخ کرنا اور قوم کی آگ میں کودنا پڑا۔'' (۴)

جب انھوں نے حالات کا متانت اور سنجیدگی سے مطالعہ کیا اور مختلف سیاسی اور سماجی عوامل کا ٹھنڈے دل ودماغ سے تجزیہ کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ملک پر انگریزوں کی گرفت کافی مضبوط ہو چکی ہے، انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اگر عوامی فلاح وبہبود کا کوئی کام کرنا ہے تو انگریزوں سے الجھنے سے احتراز کرنا ناگزیر ہے، اس لئے سرسید نے انگریزوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور مسلمانوں کو از سر نو منظم کرنے کے لئے ایک ہمہ گیر منصوبہ تیار کیا، جسے بعد میں ''علی گڑھ تحریک'' کے نام سے یاد کیا گیا، اس منصوبے کے اہم مقاصد کا جائزہ سید عابد حسین نے اس طرح پیش کیا ہے:

> ''۱- مذہب اسلام کو عیسائی مشینریوں کے حملوں سے بچانا اور اس کی حقانیت ثابت کرنا۔
>
> ۲- مسلمانوں اور انگریزوں میں جو عداوت مذہبی اور سیاسی وجوہ سے پیدا ہو گئی تھی اسے دور کر کے ان دونوں کے درمیان دوستانہ تعلقات پیدا کرنا۔
>
> ۳- اسلامی تعلیمات کی نئی تعبیر اور جدید علم طبیعی اور مذہب اسلام میں ہم آہنگی پیدا

کرنا تاکہ تعلیم یافتہ مسلمان اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے معقول پسند اور روشن خیال ہوں اور نئے زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دے سکیں۔

۴- مسلمانوں کو انگریزی زبان اور جدید علوم کو سیکھنے اور مغربی تہذیب کے اختیار کرنے پر آمادہ کرنا تاکہ وہ انگریزوں سے برابری کے درجے پر مل سکیں اور ملک کے نظم ونسق میں معقول حصہ لے سکیں۔

۵- اردو زبان کو انگریزی کے ساتھ ساتھ سرکاری زبان کی حیثیت سے برقرار رکھنے کی کوشش کرنا اور اسے ترقی دے کر اس قابل بنانا کہ اس کے اندر ترجمے اور تصنیف کے ذریعے جدید علوم وفنون کا ذخیرہ فراہم ہو جائے۔" (۵)

سرسید کی پہلی کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں، مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کے تئیں جو نفرت پیدا ہوگئی تھی اسے ختم کیا جائے اور انگریزوں کا مسلمانوں کے خلاف جو جارحانہ رویہ تھا اسے تبدیل کر کے دونوں قوموں میں یگانگت اور مفاہمت پیدا کی جائے، اس مقصد کے لئے سرسید نے بغاوت کے بعد اپنی مشہور کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' لکھی، جس میں انھوں نے مسلمانوں پر بغاوت کے تمام تر الزامات کی پرزور تردید کی اور ثابت کیا کہ بغاوت کے ذمہ دار مسلمان نہیں تھے، بلکہ خود انگریزوں کی غلط حکمت عملی تھی، اس کے علاوہ سرسید نے ایک اور رسالہ ''خیر خواہانِ مسلمانان'' لکھ کر انگریزوں اور مسلمانوں کے دلوں کی کدورت اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً وہ مضامین اور کتابچے لکھتے رہے، تاکہ دونوں قوموں کے مابین خوشگوار تعلقات کو فروغ حاصل ہو اور مسلمانوں کی فلاح وبہبود کے کام انجام دئے جا سکیں۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے مذہبی، معاشرتی، اخلاقی اور تعلیمی اصلاحات کا کام بھی شروع کیا، مذہب کے سلسلے میں ان کا خیال تھا کہ اسلامی تعلیمات کی تشریح جدید علوم وفلسفہ کی روشنی میں بھی کی جانی چاہئے، تاکہ مسلمان زمانے کے جدید تقاضوں سے عہدہ برآ ہو سکیں، اسی لئے انھوں نے مذہبی امور میں اجتہاد کی اہمیت پر زور دیا، دراصل اسلام دشمن طاقتیں خصوصاً عیسائی مبلغین مسلسل اسلام کی تصویر مسخ کر کے پیش کرنے میں مصروف تھے، جس کی وجہ سے نئی نسل کے

دلوں میں اسلام کے لئے تحقیر ونفرت کے جذبات بیدار ہورہے تھے، تعلیم یافتہ نوجوان ان باتوں سے زیادہ متاثر ہورہے تھے، اس لئے سرسید نے محسوس کیا کہ اسلامی تعلیمات کو ایک نئے علم کلام پر مبنی، منطقی انداز میں پیش کیا جائے تاکہ جدید ذہن کو مطمئن کیا جاسکے، اسی ضرورت کے پیش نظر انھوں نے قرآن کی تفسیر لکھی جس میں خالص منطقی طرز کلام اختیار کیا، توریت وانجیل کی تفسیر بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، اس ضمن میں انھوں نے قرآن اور بائبل کا تقابلی مطالعہ بھی کیا اور جہاں جہاں دونوں صحیفوں کی تعلیمات میں مماثلت نظر آئی ان کو نمایاں انداز میں پیش کیا، تاکہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان پیدا ہونے والی مذہبی غلط فہمیاں دور ہوسکیں، مشہور عیسائی عالم ولیم میور نے اپنی تصنیف ''لائف آف محمدؐ'' میں اسلام اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک پر بڑی ہوشیاری سے حملے کئے تھے، اس سے عیسائی تو بہت خوش تھے، مگر مسلمانوں کو سخت قلبی وذہنی اذیت پہنچی تھی، سرسید نے اس کا جواب ''خطباتِ احمدیہ'' لکھ کر دیا، اس کے لئے انھوں نے انگلستان کا سفر کیا، برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کے کتب خانوں میں بیٹھ کر نادر کتابوں کا مطالعہ کیا اور ولیم میور کے سارے اعتراضات کا بڑے عالمانہ اور محققانہ انداز میں جواب دیا، جس کی انصاف پسند اور غیر جانب دار حلقوں نے تعریف وتوصیف کی، مسلمانوں کی اخلاقی ومعاشرتی اصلاح کے لئے سرسید نے ۱۸۷۰ء میں رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا، اس کے ذریعے انھوں نے لوگوں کو خوابِ غفلت سے جگایا، مسلمانوں میں ''اپنی مدد آپ'' کرنے کا جذبہ بیدار کیا اور ان کو اتحاد واتفاق اور امن وآشتی کا پیغام دیا۔

سرسید نے مسلمانوں کی تعلیمی اصلاح پر بہت زیادہ زور دیا، ان کے نزدیک مسلمانوں کی زبوں حالی اور مسلم معاشرہ کی تمام تر بیماریوں کی اصل وجہ جہالت تھی، وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو ایسی تعلیم سے آراستہ کیا جائے کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے دنیا میں عزت واحترام کی زندگی بسر کرسکیں، اس وقت مدرسوں اور مکتبوں میں جو قدیم طرز کی مشرقی تعلیم رائج تھی وہ نئے عہد کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت تقریباً کھوچکی تھی، دوسری طرف گورنمنٹ اسکولوں اور کالجوں میں جو نصاب داخل درس تھا اس سے مسلمانوں کے بنیادی عقائد پر ضرب پڑتی تھی، غرض قدیم وجدید دونوں قسم کی تعلیم سے سرسید یکساں طور پر غیر مطمئن تھے، ان حالات کے پیش نظر وہ اس

نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کو جدید مغربی علوم کے ساتھ ساتھ صحیح اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور کیا جائے تاکہ وہ زندگی کے ہر چیلنج کا مقابلہ مردانہ وار کرسکیں، اس مقصد کی کامیابی کے لئے سرسید نے سہ طرفی اصلاح کا پروگرام بنایا جس کے نتیجے میں ''سائنٹفک سوسائٹی''، ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج'' اور ''محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس'' جیسے ادارے عالم وجود میں آئے۔

سرسید نے اپنی ان اصلاحی تحریکوں کا آغاز بڑے نامساعد حالات میں کیا، اس وقت مسلمان قدامت پرستی اور فرسودہ روایات کے جال میں اس طرح جکڑے ہوئے تھے کہ کسی طرح کوئی نئی بات قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے، سرسید کو اپنی تحریک شروع کرتے ہی مذہبی حلقوں کی طرف سے سخت ترین مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور اس ''جرم'' میں ان کو اذیت پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی، خطوں میں مغلظ گالیاں لکھ کر بھیجی گئیں اور ان کو قتل کرنے کی دھمکی بھی دی گئی، ''حیات جاوید'' میں حالی نے اس صورت حال کی عکاسی یوں کی ہے:

> ''سرسید کو ملحد، لامذہب، کرسٹان، نیچری، دہریہ، کافر، دجال اور کیا کیا خطابات دیے، ان کے کفر کے فتووں پر شہر شہر اور قصبہ قصبہ کے مولویوں سے مہریں اور دستخط کرائے گئے، یہاں تک کہ جو لوگ سرسید کی تکفیر پر سکوت اختیار کرتے تھے ان کی بھی تکفیر ہونے لگی۔''(۶)

لیکن سرسید نے کے پائے استقلال میں جنبش نہ آئی اور نہ ہی مایوسی کا شکار ہوئے، بلکہ وہ پورے عزم و استقلال کے ساتھ اپنی منزل مقصود کی طرف آگے ہی بڑھتے گئے، اگر ایک طرف ان کو شدید مخالفت کا سامنا تھا، تو دوسری طرف اپنے مخلص رفقاء کا تعاون ان کو برابر حاصل رہا، ان کے رفقائے کار کے خلوص و محبت اور امداد و تعاون ہی کا نتیجہ ہے کہ سرسید کے بعد بھی ان کی تحریک پوری شان و شوکت کے ساتھ جاری رہی، یوں تو ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا لیکن خصوصیت کے ساتھ مولوی سمیع اللہ خاں، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولوی چراغ علی، مولانا حالی، مولانا شبلی، مولوی ذکاء اللہ اور مولوی نذیر احمد کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں، سرسید کے تمام رفقاء بڑی خوبیوں کے مالک تھے اور اپنے آپ میں ایک علمی ادارہ کی حیثیت رکھتے تھے، ان میں شبلی کا ایک خاص مقام تھا، وہ بڑے ذہین طباع اور بڑی باکمال شخصیت کے مالک تھے۔

شبلی ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ تشریف لے گئے اور سرسید کی اصلاحی تحریکوں میں شریک ہو کر ان تحریکوں کو نئی قوت اور توانائی عطا کی، سرسید کی طرح شبلی کو بھی اسلام اور مسلمانوں کے مسائل سے گہری دل چسپی تھی، مسلم نوجوانوں کو مذہب اسلام سے متنفر کرنے کے لئے یورپین اہل قلم نے جو تحریک چلا رکھی تھی وہ بڑی ہی خطرناک تھی، خاص طور سے اسلامی تاریخ کو وہ اپنی تنقید کا نشانہ بناتے اور اس کو اس انداز میں پیش کرتے کہ مسلمانوں کو خود اس سے گھن آنے لگے۔

شبلی نے اس خطرے کو محسوس کیا اور ان کا جواب لکھنے کے لئے قلم اٹھایا انھوں نے ۱۸۸۷ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس کے لئے سرسید کی فرمائش پر ایک جامع مضمون ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' کے عنوان سے لکھا، یہیں سے ان کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا اور اسی مضمون سے ان کی شہرت کا آفتاب طلوع ہوا، گذشتہ تعلیم کے بعد شبلی نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیفات ''المامون''، ''سیرۃ النعمان'' اور ''الفاروق'' لکھ کر شائع کیں، جن کو اہل علم نے بڑی قدر ومنزلت کی نگاہوں سے دیکھا اور ملک میں شبلی کے قلم کو شہرت حاصل ہوئی، ان کتابوں پر اخباروں اور رسالوں میں تبصرے اور ریویو لکھے گئے اور ان کے ان قابل فخر کارناموں کی تعریف وتوصیف کی گئی، چونکہ اس وقت مغربی علوم وفنون کی چمک دمک سے لوگ متاثر ہو رہے تھے اور ان کے زیر اثر ہزاروں دلوں میں شکوک وشبہات پیدا ہو رہے تھے اور ذہن ودماغ پر ان کا سایہ بڑھتا جا رہا تھا، اس لئے شبلی نے خاص طور سے اسلامی علوم اور اس کے فیوض وبرکات اور اساطین اسلام کے کارناموں کو اپنی تصنیفات کا موضوع بنایا، تاکہ لوگوں کے شکوک وشبہات دور ہو سکیں اور ناصاف ذہنوں کو پاک وصاف کرنے میں یہ کتابیں معاون ہوں، اس کے علاوہ انھوں نے مسلمانوں کی تہذیب وتمدن کی خصوصیات پر بہت سے محققانہ مضامین لکھ کر مذہب اسلام پر دشمنوں کے عائد کردہ الزامات کی تردید کی، ان مقالوں میں خاص طور سے ''کتب خانہ اسکندریہ''، اسلامی حکومتیں اور شفاخانے'' اور رسالہ ''الجزیہ'' بڑی اہمیت کے حامل ہیں، ان تمام مضامین کو بعد میں ''مقالات شبلی'' کے نام سے شائع کیا گیا، جن کو آج بھی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، ان کتابوں اور مقالوں کی ترتیب وتکمیل میں شبلی کو در در کی خاک چھاننا پڑی، گھاٹ گھاٹ کا پانی پینا پڑا، اس سلسلے میں ان کو جن جن مرحلوں سے گزرنا پڑا، آگے چل کر وہی سب دار المصنفین کے قیام کا سبب بنا۔

یہ سرسید کی صحبت اور علی گڑھ تحریک کا فیضان تھا کہ شبلی کے فکر وعمل میں وسعت پیدا ہوئی اور ان میں نئے انداز سے ملی ومذہبی خدمت کا جوش ابھرا اور وہ قومی جذبہ سے پوری طرح سرشار ہوئے، لیکن افسوس ہے کہ وہ زیادہ دنوں تک علی گڑھ میں نہ رہ سکے، سرسید سے بعض سیاسی ومذہبی معاملات میں ایسا اختلاف پیدا ہوا جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا اور (سرسید کی وفات کے بعد) علی گڑھ سے شبلی کی علاحدگی پر منتج ہوا، علی گڑھ سے نکلنے کے بعد وہ سررشتۂ علوم وفنون کی نظامت پر فائز ہوئے اور چار برس تک حیدر آباد میں قیام پذیر رہے، وہاں رہ کر انھوں نے تصنیف وتالیف کا دروازہ کھول دیا، ''الغزالی''، ''علم الکلام''، ''الکلام''، ''سوانح مولانا روم''، ''موازنہ انیس ودبیر'' اور شعر العجم کی چند جلدیں وہیں پر ضبط تحریر میں آئیں۔

لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء ۱۸۹۴ء میں قائم ہو چکا تھا، شبلی کو اس ادارہ سے گہرا لگاؤ تھا، ان کے خیال میں اس وقت ندوہ ہی قوم کی صحیح رہنمائی اور فلاح و بہبود کا فریضہ انجام دے سکتا تھا اس لئے اس کی تعمیر وترقی کے لئے وہ ہمیشہ کوشاں رہے، جب ان کو اتفاق رائے سے ندوہ کا سکریٹری منتخب کیا گیا تو وہ حیدر آباد سے مستعفی ہوکر ۱۹۰۵ء میں لکھنؤ چلے آئے، اپنا عہدہ سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے انھوں نے اصلاح نصاب پر توجہ کی، بعض قدیم عربی کتابوں کو نصاب تعلیم سے خارج کر کے ان کی جگہ پر دوسری مفید کتابوں کو داخل درس کیا، اس زمانے میں بیشتر مسلمانوں کے نزدیک انگریزی تعلیم قابل قبول نہ تھی، ناسازگار اور مخالف حالات کے باوجود شبلی نے اس کا بھی بندوبست کیا اور بہت سے طلباء اس سے مستفید ہوئے، ہندی اور سنسکرت کا بھی ایک درجہ قائم کیا اور اس کے لئے ایک پنڈت استاد کو مقرر کر کے طالب علموں کو ہندی اور سنسکرت کی تعلیم دلائی، ملک کے مختلف حصوں سے قابل اور لائق اساتذہ کو دارالعلوم میں بلایا اور ندوہ کے تعلیمی معیار کو بلند کیا، رسالہ ''الندوہ'' طلبائے دارالعلوم کی ذہنی تربیت کے لئے ۱۹۰۴ء میں جاری کیا گیا تھا، لیکن ابھی تک اس کی حیثیت بڑی معمولی تھی، شبلی نے اپنی کوششوں سے اس کا معیار بلند کیا، ''الندوہ'' میں شائع ہونے والے مضامین نے علمائے کرام کی فکر ونظر میں انقلاب پیدا کیا اور ان کے سامنے جدید مباحث کے دروازے کھول دئے، یہ ''الندوہ'' کا بڑا کارنامہ تھا کہ اس نے اپنے عہد کے جامد فکر ونظر کے حامل علماء کے خیالات میں تحریک پیدا کی اور ان کو تحقیق وتدقیق کی طرف مائل کیا، اس کے

علاوہ طلبائے دارالعلوم نے ''الندوہ'' سے بڑا فائدہ اٹھایا، بے شمار طالب علموں نے اس جریدہ کی بدولت لکھنے کا سلیقہ سیکھا اور بہت سے لائق مضمون نگار اور مستند مصنف پیدا ہوئے، مولوی ضیاء الحسن علوی ندوی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، خواجہ عبدالواجد ندوی، مولوی اکرام اللہ ندوی، مولوی عبدالرحمٰن نگرامی اور مولوی قمرالدین ندوی وغیرہ ''الندوہ'' کے فیضان تربیت ہی سے مصنف کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔

شبلی طلباء میں تحریری صلاحیت پیدا کرنے کی خاص کوشش کرتے، اس کے لئے وہ خود ذہین طلباء کی تلاش میں رہتے، ان کو اپنے پاس بلاتے اور تلخیص و ترجمہ کا فن اور اس کے اصول ومبادی سمجھاتے، مطالعہ کے لئے کتابیں تجویز کرتے، ان کو موضوع دے کر مضامین لکھواتے اور ان کی اصلاح کرتے، طرز تحریر اور عبارت کو عام فہم بنانے کی طرف خاص طور سے طلباء کو متوجہ کرتے، دراصل یہ سب نئے عہد کا تقاضا تھا، جس کو شبلی بہ خوبی سمجھ رہے تھے، کیوں کہ اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کو انگریزی علوم وفنون کی شکل میں ایک بڑے چیلنج کا سامنا تھا، اس لئے شبلی علماء اور مصنفین کی ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتے تھے جن کی تحریریں صرف اس زمانے ہی کے لئے نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے بھی مشعل راہ ثابت ہوں، شبلی کی ان کوششوں کا مولانا سید سلیمان ندوی نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

> ''انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد یہ قرار دیا تھا کہ وہ اپنے سامنے اور اپنے بعد بھی علماء کا ایک گروہ ایسا چھوڑ جائیں جو اس نئے زمانہ میں اسلام کی اس نئی ضرورت کو پورا کرتا رہے۔''(۷)

شبلی کا یہ مقصد دارالمصنفین کے قیام کی نشاندہی کرتا ہے اس کے علاوہ اس وقت ملک میں مغربی علوم وفنون کی بدعتیں تیزی سے پھیل رہی تھیں، مستشرقین اسلامی علوم وفنون کی تحقیق و تدقیق میں مستغرق تھے اور بڑی ہوشیاری سے اسلام کی بیخ کنی کرنے کے لئے مسلمانوں کی کتابوں کا استعمال کر رہے تھے، مگر ہمارے علماء حالات کی نزاکت سے بے خبر پرانے ڈھرے پر گامزن تھے، ان کا دائرہ پرانی درسیات تک محدود تھا، جن میں تصنیف وتالیف کی صلاحیت موجود تھی وہ پرانی درسی کتابوں کی شرح در شرح، حاشیہ اور غیر مفید مناظرانہ رسائل لکھنے میں مصروف تھے شبلی اس صورت

حال سے مطمئن نہ تھے، اور عصری تقاضوں کے مطابق پورے منظر نامہ کو بدل دینے کے خواہاں تھے اسی لئے ان کے ذہن میں دارالمصنفین کا خیال پیدا ہوا، ان تمام امور پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"ہمارے علماء پر مدرسیت اتنی چھا گئی تھی کہ ان کی نظر درسی کتابوں اور ان کے شروح وحواشی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی، زیر درس کتابوں کے علاوہ کسی نئی کتاب کا دیکھنا، کسی اور علم وفن کی کتاب سے استفادہ، قلمی کتابوں کی تلاش اور نوادر کتب کے مطالعہ کا شوق عموماً ناپید تھا، مولانا کو اللہ تعالیٰ نے یہ ذوق فطری عنایت فرمایا، انھوں نے ہر علم وفن کی بکثرت کتابیں مطالعہ کیں، نوادر کتب بہ کثرت بہم پہنچائے، کتب خانے چھانے، دنیا کے کونہ کونہ سے مطبوعات منگوائے، ادب، محاضرات، فتوح، تاریخ، رجال، فلسفہ، منطق، کلام کا بڑا سرمایہ جمع کیا، اور اپنی تصنیفات اور مضامین میں ان کے حوالے دیئے، نصاب تعلیم میں ان میں سے بعض کو داخل کیا، طلباء اور علماء کو ان کے مطالعہ کی ترغیب دی اور اپنے شاگردوں اور ہمنشینوں میں اس کا ذوق پیدا کیا، ندوہ کے ایک اجلاس میں علماء کے فرائض پر تقریر کرتے ہوئے خاص طور سے ادھر توجہ دلائی، ان کو یہ دیکھ کر دلی تکلیف ہوتی تھی کہ یورپ کے مستشرقین جن کو اسلام سے کوئی واسطہ نہ تھا، وہ تو مسلمانوں کے علوم وفنون کی نادر کتابوں کی فراہمی، تصحیح، تحشیہ اور اشاعت میں ایسی جانفشانیاں دکھا رہے ہیں اور مسلمان علماء جو ان علوم کے اصل وارث تھے ان کو اپنے ان خزانوں کی خبر نہیں، چہ جائے کہ ان کی تلاش وتصحیح ومطالعہ واشاعت کی زحمت اٹھائیں، مولانا نے اسی شوق میں ایک دفعہ یہ ارادہ کیا کہ ان کی اشاعت کی خاطر ایک مجلس قائم کی جائے، اس کا اعلان بھی کیا، مگر خاطر خواہ جواب نہیں ملا، اسی سلسلہ میں دائرۃ المعارف حیدرآباد کو متوجہ کیا اور اس سے فائدہ پہنچا، اور کہا جا سکتا ہے کہ ان کی یہ تحریک علماء میں ناکام نہیں رہی، ان ہی غرضوں کے لئے دارالمصنفین کا خاکہ ان کے دماغ میں آیا تھا، جو ان کی زندگی کا اخیر کارنامہ تھا"۔(۸)

چنانچہ شبلی نے دارالمصنفین کی تجویز سب سے پہلے ۱۹۱۰ء میں ندوہ کے ایک اجلاس میں پیش کی جو دہلی میں منعقد ہوا تھا، انھوں نے اپنی سالانہ رپورٹ میں ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کی

ضرورت کے سلسلے میں یہ تحریر فرمایا:

"قومی اور مذہبی ضروریات میں جس قدر ایک قومی مدرسہ، ایک قومی کالج، ایک قومی یونیورسٹی کی ضرورت ہے، اسی قدر ایک قومی کتب خانۂ اعظم کی بھی ضرورت ہے، اگر مسلمانوں کے مذہب، مسلمانوں کے علوم، مسلمانوں کی قومی تاریخ کو زندہ رکھنا ہے تو ضرور ہے کہ ایک ایسا کتب خانہ بہم کیا جائے جس میں علوم مذہبی سے متعلق نادر اور بیش بہا تصانیف موجود ہوں، جس میں مسلمانوں کے خاص ایجاد کردہ علوم وفنون کا کافی سرمایہ ہو، جس میں ہر فن کے متعلق، وہ تمام کتابیں موجود ہوں جو اس فن کے دور ترقی کے مدارج ہیں، جس میں قدماء کے عہد کی یادگاریں ہوں اور ان سب باتوں کے ساتھ یہ کتب خانہ کسی کا ذاتی نہ ہو، بلکہ وقف عام ہو، تاکہ تمام ہندوستان کے مسلمان اور بالخصوص مصنّفین اور اہل قلم اس سے فائدہ اٹھا سکیں، یہ تجویز کہ ندوہ میں ایک دائرۂ تالیف قائم کیا جائے، جس کے ارکان کا کام صرف مطالعۂ کتب اور تصنیف وتالیف ہو، جس طرح یورپ میں اکاڈمیاں ہوتی ہیں، یہ بھی اسی وقت پوری ہوسکتی ہے جب ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کر دیا جائے۔"(۹)

اسی جلسہ میں شبلی نے مولانا سید سلیمان ندوی سے بھی دارالمصنّفین کے قیام کی تجویز پیش کرنے کو کہا تھا، چنانچہ سید صاحب نے "ندوہ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ کی ضرورت" کے عنوان پر تقریر فرمائی اور دارالمصنّفین کی ضرورت واہمیت کو واضح کیا، اگست ۱۹۱۰ء میں نواب مزمل اللہ خاں سرکاری خطاب سے سرفراز ہوئے تو انھوں نے خوش ہوکر تصنیفات شبلی کی یادگار میں دارالعلوم میں ایک کمرہ بنوانے کی خواہش ظاہر کی، اس کے جواب میں شبلی نے "الندوہ" میں یہ نوٹ شائع کیا:

"جناب نواب صاحب موصوف نے ہم کو خط لکھا ہے کہ وہ دارالعلوم کی بورڈنگ کا ایک کمرہ ہماری تصنیفات کی یادگار میں بنوانا چاہتے ہیں، ہماری تصنیفات کی تو خیر کیا وقعت ہے، لیکن نواب صاحب موصوف چوں کہ علم دوست ہیں، اس لئے انھوں نے علم پروری کا یہ بھی ایک بہانہ پیدا کرلیا ہے لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ دارالعلوم میں ایک عمارت

دارالمصنفین کے نام سے تعمیر ہو جس کا یہ مقصد ہو کہ اس میں تالیف و تصنیف کا ایک دفتر ہو اور اس سے باقاعدہ تصانیف شائع ہوں، باہر کے مصنف اگر چاہیں تو اس میں آ کر رہیں، ان کے لئے ہر قسم کے آرام کا سامان مہیا کیا جائے، تمام ضروری علوم و فنون کی کتابیں مہیا رہیں، چونکہ ندوہ کے تعلیم یافتہ طلباء میں تصنیف و تالیف کا مذاق خصوصیت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، اس لئے دارالمصنفین کی تجویز ہر طرح موزوں ہے، نواب مزمل اللہ خاں صاحب سے ہم یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی رقم کو اس مد میں منتقل فرمائیں لیکن شرط یہ ہے کہ ملک کے اور باہمت اور علم دوست حضرات اس سرمایہ میں اضافہ فرمائیں، اس وقت صرف عمارت اور ضروری سامان کے لئے دس ہزار روپے درکار ہوں گے۔'' (۱۰)

اسی دوران مولانا شبلی اور ندوۃ العلماء کے دوسرے اکابرین کے درمیان اختلافات نے شدت اختیار کر لی اور مفاہمت کے امکانات معدوم ہو گئے، اس صورت حال سے دل برداشتہ ہو کر شبلی نے جولائی ۱۹۱۳ء میں ندوۃ العلماء کی معتمدی سے استعفاء دے کر وہاں کے معاملات سے کنارہ کشی اختیار کر لی، لیکن وہ دارالمصنفین کے قیام کا مصمم ارادہ کر چکے تھے اس لئے ندوہ سے علاحدگی کے بعد بھی وہ اس منصوبہ سے دست کش نہیں ہوئے، چنانچہ انھوں نے یکم نومبر ۱۹۱۲ء کو منشی امین زبیری (لٹریری سکریٹری بیگم بھوپال) کو اس سلسلے میں یہ خط لکھا:

''ہاں یہ دونوں (سلیمان اور عبدالسلام) اچھے بن گئے مبخت مخالفین نے اوقات اور کام میں خلل ڈال دیا، ورنہ اور بھی داغ بیل پڑ رہی تھی، بہر حال یہ طے ہو لے کہ کہاں صدر مقام کروں تو پھر ارباب قلم کی تربیت شروع کروں، انشاء اللہ سیرت ہی کے دفتر کو وسیع کرتا ہوں کہ دائرۃ التالیف بن جائے، ہندوستان میں اور کام کے لئے انجمنیں ہیں لیکن تصنیفی انجمن کا میدان خالی ہے اور یہ سب سے بڑا اہم کام ہے، ایک لائق مصنف ہزاروں آدمیوں کے دل پر حکمرانی کرتا ہے۔'' (۱۱)

علامہ شبلی کے دل میں دارالمصنفین کا خیال اس قدر پختہ ہو گیا تھا کہ انھوں نے ''الہلال'' میں ''ایک اہم تجویز'' کے عنوان سے یہ تحریر شائع کی:

''خدا کا شکر ہے کہ ملک میں تصنیف و تالیف کا مذاق پھیلتا جاتا ہے، اور قابل قدر

ارباب کرم پیدا ہوتے جاتے ہیں لیکن بایں ہمہ اس گروہ میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جن کو مصنف کے بجائے مضمون نگار یا انشاء پرداز کہنا زیادہ موزوں ہوگا، کیوں کہ ان کی مستقل تصنیفیں نہیں ہیں، بلکہ معمولی رسالے یا مضامین ہیں، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کو اعلیٰ درجہ کی تصنیف کی قابلیت نہیں، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی تصنیف کے لئے جو سامان درکار ہے وہ مہیا نہیں ہے، ان میں سے اکثر کے پاس کتابوں کا ذخیرہ نہیں جو انتخاب اور استنباط اور اقتباس کے کام آئے، اتفاق سے اگر کوئی مقامی کتب خانہ موجود ہے تو دل جمعی کے اسباب نہیں کہ اطمینان سے چند روز وہاں رہ کر کتابوں کا مطالعہ اور اس سے استفادہ اور نقل وانتخاب کرسکیں، ان باتوں کے ساتھ کوئی علمی مجمع بھی نہیں کہ ایک دوسرے سے مشورہ اور مبادلۂ خیالات ہوسکے۔

ان مشکلات کے حل اور تصنیف وتالیف کی ترقی کے لئے ضرور ہے کہ ایک وسیع ''دارالتصنیف'' امور ذیل کے موافق قائم کیا جائے۔

۱- ایک عمدہ عمارت ''دارالتصنیف'' کے نام سے قائم کی جائے، جس میں ایک وسیع ہال کتب خانہ کے لئے ہو، اور جس کے حوالی میں ان لوگوں کے قیام کے لئے کمرے ہوں جو یہاں رہ کر کتب خانہ سے فائدہ اٹھانا اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہنا چاہتے ہوں۔

۲- یہ کمرے خوبصورت اور خوش وضع ہوں اور ان مشہور مصنفین کے نام سے موسوم ہوں جو تصنیف کی کسی خاص شاخ کے موجد اور بانیٔ فن ہوں۔

۳- ایک عمدہ کتب خانہ فراہم کیا جائے، جس میں کثرتِ تعداد ہی پر نظر نہ ہو، بلکہ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ جس فن کی کتاب ہو، نادر اور کمیاب ہو۔

۴- تصنیفی وظائف قائم کئے جائیں اور وظیفہ عطا کنندہ کے نام سے موسوم کیا جائے یہ وظائف یا ماہوار ہوں گے یا کسی تصنیف وتالیف کے لئے صلہ کے طور پر دئے جائیں گے۔

۵- جو لوگ کم از کم پانچ سو روپیہ یک مشت عطا فرمائیں گے ان کے نام اس عمارت

پراگندہ کیے جائیں گے، میں یہ تجویز بالکل ایک سرسری صورت میں پیش کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ سردست محض ایک خاکہ کے طور پر اس کی بنیاد قائم ہو جائے، جو رفتہ رفتہ خود بخود وسعت حاصل کرتی جائے گی، اس بات کا مجھ کو اطمینان ہے کہ ریاست ہائے اسلامی سے اس کے ماہوار مقرر ہو سکیں گے، سردست ہم کو صرف دس ہزار روپیہ درکار ہے، جس سے ایک مختصر تعمیر کی بنیاد ڈال دی جائے، اصل فنڈ کے لئے پچاس ہزار روپیہ کا تخمینہ کیا گیا ہے۔

۶ - دس ہزار کی رقم میں، میں سردست ایک ہزار اپنا پیش کرتا ہوں اور میں اس بات کا بھی متدعی ہوں کہ جن بزرگوں کو میری تجویز سے دلچسپی ہو، مجھ سے خط و کتابت فرمائیں اور مناسب مشورہ سے میری ہمت افزائی کریں، نیز ایڈیٹران ''ہمدرد''، ''وطن''، ''پیسہ اخبار''، ''مشرق''، ''البشیر''، ''وکیل'' وغیرہ سے درخواست ہے کہ اس تجویز کو اپنے اپنے اخبار میں شائع فرمائیں''(۱۲)

انھوں نے اس تجویز کا انگریزی ترجمہ بھی کرایا اور اس کو اہالیانِ ملک کے سامنے پیش کیا بالخصوص اپنے احباب خاص کی توجہ اس کی طرف مبذول کرائی، اسی سلسلے کی ایک کڑی ان کا وہ خط بھی ہے جو مولوی ریاض الحسن خاں کو ۲۶ رفروری ۱۹۱۴ء کو انھوں نے تحریر کیا تھا:

''ہاں دار المصنفین کی تجویز الہلال میں کیا نظر سے نہیں گزری، ضرور دیکھیے، آپ اس کے خاص مخاطب ہیں، اس کے لئے خود وہاں تک آؤں گا، یہ میرا اخیر کام اور زمرۂ مصنفین کی دائمی خدمت ہے۔''(۱۳)

اس سلسلے میں سب سے اہم کام جگہ کے تعین کا تھا کہ دار المصنفین کہاں قائم ہو؟ شبلی کی دلی خواہش اسے ندوہ میں قائم کرنے کی تھی، لیکن وہاں کے حالات اس کے لئے سازگار نہیں تھے اس لئے انھوں نے اس کے بارے میں بعض احباب سے مشورہ طلب کیا، ۱۴ رفروری ۱۹۱۴ء کو مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو ایک خط میں انھوں نے لکھا:

''ہاں دار المصنفین پر کیوں آپ نے سکوت کیا، آپ سے بڑھ کر اس کی شرکت کا کس کو حق ہے، میں اس عمارت کو انشاء اللہ تعالیٰ پورا کر کے رہوں گا اور شاید وہی میرا مدفن بھی ہو''(۱۴)

پھر ۳/ مارچ ۱۹۱۴ء کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

''دارالمصنفین کی تجویز میں قطعاً طے کر چکا ہوں، کہیں سے بندوبست نہ ہوا تو موجودہ ابتدائی عمارت جس کا تخمینہ پانچ ہزار روپیہ ہے میں خود اپنے پاس سے ادا کر دوں گا۔

چھوٹے چھوٹے بنگلے اور احباب سے بنوالوں گا۔

بہر حال اس وقت صرف آپ سے یہ مشورہ مطلوب ہے کہ کہاں بنے؟ اگر علی گڑھ یا کہیں اور بنے تو لوگ مولوی سمیع اللہ خاں کا مقلد کہیں گے، اس لئے میں اتمام حجت کے طور پر چاہتا ہوں کہ پہلے ندوہ کے تمام ارکان سے پوچھ لوں، اگر وہ منظور نہ کریں تو پھر مجھ پر اعتراض نہ ہوگا، پر لطف تجویزیں دارالمصنفین کے متعلق ذہن میں ہیں'' (۱۵)

اس کے لئے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اپنے وطن ''حبیب گنج'' کو پیش کیا، لیکن وہ جگہ شبلی کو پسند نہ آئی، چنانچہ انھوں نے ۹/ مارچ ۱۹۱۴ء کو یہ مراسلہ لکھا:

''آپ دارالمصنفین کو حبیب گنج لے جانا چاہتے ہیں، تو حضرت میں اعظم گڑھ کو کیوں نہ پیش کروں؟ اعظم گڑھ میں اپنا باغ دو بنگلے پیش کر سکتا ہوں، خیر اس پر مل کر گفتگو ہوگی۔'' (۱۶)

شبلی دارالمصنفین کو ندوہ ہی میں قائم کرنے کی خواہش رکھتے تھے اور بعض دوسرے حضرات بھی ان کے ہم خیال تھے، چنانچہ جب مولانا مسعود علی ندوی نے بھی اسی طرح کا خیال ظاہر کیا تو شبلی نے ان کو ۲۷/ جولائی ۱۹۱۴ء کو یہ خط لکھا:

''بھائی وہ لوگ دارالمصنفین ندوہ میں بنانے کب دیں گے کہ میں بناؤں، میری اصلی خواہش ہے، لیکن کیا کیا جائے، حالانکہ اس میں انھیں کا فائدہ ہے۔'' (۱۷)

ساری دقتوں کے باوجود علامہ شبلی کا خیال تھا کہ دارالمصنفین کا صدر مقام لکھنؤ ہی میں ہو، چنانچہ انھوں نے ۱۸/ جولائی ۱۹۱۴ء کو اس سلسلے میں مولوی مسعود علی ندوی کو یہ خط تحریر فرمایا:

''ایک کام کرنے کا تو یہ ہے کہ دارالمصنفین کا بندوبست کرو، راجہ صاحب محمود آباد نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے نجف کے پاس زمین لی ہے، چاہو تو وہیں تم کو بھی دلا دوں، کہو تو میں ان کو لکھوں اور تمام معاملات تمہارے ہاتھ سے انجام پائیں، اگر زمین مل جائے

تو ایک مختصر پھونس کا بنگلہ اور چند چھپر کے کمرے بنوا لئے جائیں، پھر کام چلتا رہے گا، غالبا وہاں میری صحت بھی درست رہے۔" (۱۸)

ابھی دار المصنفین کے صدر مقام کے سلسلے میں صلاح و مشورہ جاری ہی تھا کہ شبلی کے چھوٹے بھائی مولوی محمد اسحاق صاحب کا اگست ۱۹۱۴ء میں انتقال ہو گیا، اس حادثہ کی خبر سن کر مولانا شبلی اعظم گڑھ چلے آئے، یہاں ان کو کچھ سکون نظر آیا اور انھوں نے یہیں مستقل قیام کرنے اور دار المصنفین کو قائم کرنے کا فیصلہ کرلیا، چنانچہ اس سلسلے میں ۴ ستمبر ۱۹۱۴ء کو مولانا مسعود علی ندوی کو یہ خط تحریر فرمایا:

"میں یہاں تکمیل کا درجہ کھول دوں گا، تم طلباء کے نام سے مطلع کرو اور خود ان کو لکھ دو کہ مجھ سے خط و کتابت کریں، میں نے یہاں اپنا مستقل انتظام کرلیا ہے، ہر طرح کا آرام اور پھیلاؤ ہے، تعلیمی کام شروع ہو گئے ہیں، کسی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں، بالکل ایک بادشاہت معلوم ہوتی ہے، افسوس ہوتا ہے کہ میں نے کیوں اتنے دن پاجیوں میں بسر کئے، باغ ہے، بنگلہ ہے، حکومت ہے، گریجویٹ ہیں، اسکول ہے، تعلیمی انجمن ہے اور سب حسب دل خواہ کام کرتے ہیں، نہ کہ وہاں سگان بازاری کے ساتھ عوعو میں مبتلا ہونا، دار المصنفین بھی شروع ہو جائے گا۔" (۱۹)

پھر ۵ ستمبر ۱۹۱۴ء کو مولانا سید سلیمان ندوی کو یہ خط روانہ کیا:

"میں اب اعظم گڑھ میں ہوں، اور ارادہ ہے کہ یہیں مستقل قیام کروں، استقلال کا ہر طرح سامان کر رہا ہوں، دار المصنفین کے لئے بنگلہ اور باغ وقف کرنا چاہتا ہوں، چوں کہ خاندان کے اور لوگ شریک ہیں اس لئے ان کو بھی وقف پر آمادہ کر رہا ہوں، پندرہ بیگہہ خام رقبہ ہے، اسی میں نیشنل اسکول بھی آجائے گا، درجہ تکمیل کے لئے شائقین کو اطلاع دینا ہے، اگر آؤ تو اعظم گڑھ آؤ، تمہارے قیام کے لئے ایک کمرہ مع ضروریات کے موجود ہے۔" (۲۰)

اس کے بعد علامہ شبلی نے دار المصنفین کی تاسیس کے لئے ضروری اقدامات کرنے شروع کر دئے، اپنا باغ اور بنگلہ وقف کرنے کے ساتھ ساتھ خاندان کے دوسرے شرکاء کو بھی اس کار خیر پر

آمادہ کیا اور جس قدر کتابیں بآسانی دستیاب ہوسکیں ان کو جمع کیا، اس سلسلے میں مولانا سید سلیمان ندوی کو ۱۰ اراکتوبر ۱۹۱۴ء کے ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

"تمہارا انتظار بہت رہا، مسعود آئے بھی اور چلے گئے، وہ تو اس ویرانہ کو علمی کوششوں (دارالمصنفین وتکمیل وغیرہ) کی جولان گاہ بننے کے قابل خیال کرتے ہیں، کتابیں بقدر ضرورت مہیا ہوگئی ہیں، چھ سات الماریاں بھر گئی ہیں، وقف نامۂ باغ زیر تحریر ہے، بنگلہ کے بغل میں مختصر سا دارالضیوف بن گیا، غالباً تم کو تکلیف نہ ہوگی، لیکن آؤ تو چند روز ٹھہرو۔" (۲۱)

ان مراحل کو طے کرنے کے بعد ان کے سامنے سب سے بڑا اور مشکل مسئلہ آمدنی کا تھا، کیوں کہ ابھی تک اس کا کوئی مستقل انتظام نہ ہوسکا تھا اور اس کے بغیر کام کو آگے بڑھانا ممکن نہیں تھا، اس لئے مولانا نے درجۂ تکمیل کے وظائف کے لئے مولانا حمیدالدین فراہی مرحوم سے تیس روپیہ ماہوار مقرر کرایا، اتنا ہی خود اپنے ذمہ لیا اور طلباء کی رہائش کے لئے اپنے والد مرحوم کا مکان جو دوسرے حصہ دار کے قبضہ میں تھا کرایہ پر لیا، اس بندوبست کے بعد انھوں نے دارالمصنفین کا ایک تعلیمی خاکہ تیار کیا جو درج ذیل ہے۔

۱- مدت تعلیم دو سال۔

۲- اس کی دو شاخیں ہوں گی، تکمیل وتصنیف۔

۳- ہر طالب علم جو صرف ونحو کافی جانتا ہو، اس درجہ میں داخل ہوسکے گا۔

۴- اس درجہ میں داخل ہونے کے لئے ایک سرسری امتحان لیا جائے گا۔

درجۂ تکمیل

اس درجہ میں دو مضمون لازمی ہوں گے، ادب اور علوم ثلاثہ میں سے کوئی ایک یعنی قرآن مجید مع تفسیر، حدیث، علم کلام مع فلسفہ۔

درجۂ تصنیف

۱- اس میں وہ شخص شامل ہوسکے گا، جس کو انشاء پردازی کا فی الجملہ مذاق ہو، اور عربی صرف ونحو کافی طور سے جانتا ہو، اور ادب میں معمولی استعداد رکھتا ہو۔

۲- اگر کوئی شخص عمدہ انشاء پرداز ہو لیکن عربی زبان سے ناواقف ہو تو اس کو موقع دیا جائے گا کہ عربی زبان حاصل کر سکے۔

طریقۂ تعلیم ، فن تصنیف:

۱- پہلے چھوٹے چھوٹے علمی عنوان دیے جائیں گے، اور مضامین لکھوائے جائیں گے۔

۲- پھر چھوٹے چھوٹے علمی رسائل لکھوائے جائیں گے۔

۳- ہر مضمون کے متعلق اس کے ماخذ بتائے جائیں گے، اور تمام ماخذ مہیا کر دیے جائیں گے کہ مطالعہ کر سکے۔

۴- پھر جو (عبارت ناتمام رہ گئی) (۲۲)

اس کے بعد طلباء کے انتخاب کا مسئلہ آیا اور ان کی تلاش وجستجو شروع ہوئی، چنانچہ ۱۵/اکتوبر ۱۹۱۴ء کو اس کے متعلق مولانا مسعود علی ندوی کو یہ خط تحریر فرمایا:

''درجۂ تکمیل یا تصنیف والوں کے متعلق نقشہ ذیل کی خانہ پری کر کے بھیج دو۔

۱- نام اور پتہ یعنی سکونت وغیرہ۔

۲- مستطیع ہیں یا غیر مستطیع۔

۳- کس فن کی تکمیل چاہتے ہیں، سردست صرف تفسیر اور ادب کی تکمیل کا انتظام ہو سکتا ہے۔

۴- کتنی مدت قیام کریں گے۔

۵- مقصد زندگی کیا ہے؟

۶- وضع ولباس وفرائض میں علماء کی وضع کے پابند رہ سکتے ہیں یا نہیں گو یہ جزئی بات ہے، لیکن میں شروانی اور بوٹ تک کو ناپسند کرتا ہوں قص لحیہ تو سخت ناگوار ہے، میں صرف تعلیم نہیں بلکہ تربیت بھی چاہتا ہوں، ایسے لوگ درکار ہیں جن کی صورت اور سیرت دونوں عالمانہ ہو، علماء کا ہمیشہ قاضی ابو یوسف کے زمانہ سے ایک خاص لباس رہا ہے، طلباء بھی اس کے قریب قریب استعمال کرتے تھے۔'' (۲۳)

غرض دارالمصنفین کی تاسیس کی تیاریوں میں علامہ شبلی پوری طرح منہمک ہوگئے، لیکن قضا وقدر کے معاملات سے کون واقف ہے، شبلی کی صحت کافی دنوں سے خراب چلی آرہی تھی، ہر چند علاج ومعالجہ ہوا، لیکن سب بیکار ثابت ہوا اور بالآخر ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو وہ اس جہان فانی سے رخصت ہوگئے، اس وقت دارالمصنفین کا کل اثاثہ محض دو کچے بنگلوں اور کتابوں کی چند الماریوں پر مشتمل تھا، ان کے انتقال کے بعد ان کے تلامذہ نے دارالمصنفین کے قیام کی باقاعدہ کوشش شروع کی، وفات کے تیسرے دن شبلی کے نامکمل منصوبوں کی تکمیل کے لئے مولانا حمیدالدین فراہی مرحوم کی تحریک پر ایک مجلس ''اخوان الصفا'' کے نام سے تشکیل دی گئی، اس مجلس کا اولین مقصد سیرت نبوی کی تکمیل قرار پایا، اس مجلس کے صدر مولانا حمیدالدین فراہی اور ناظم مولانا سید سلیمان ندوی مقرر ہوئے، یہ دونوں بزرگ والیٔ بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سیرت نبوی کا ماہانہ وظیفہ جو شبلی کو ملتا تھا جاری رکھنے کی ان سے اپیل کی، جس کو سرکار عالیہ نے قبول فرمایا اور وظیفہ بدستور جاری رہا، اس کے بعد مولانا کے باغ اور بنگلہ کا وقف نامہ جو نامکمل رہ گیا تھا اسے پورا کیا گیا، دارالمصنفین کے اغراض ومقاصد اور قواعد وضوابط مرتب کئے گئے اور اس کو انگریزی اور اردو میں شائع کیا گیا، دارالمصنفین کے مقاصد حسب ذیل قرار پائے:

''۱- ملک میں اعلیٰ مصنفین اور اہل قلم کی جماعت پیدا کرنا۔

۲- بلند پایہ کتابوں کی تصنیف وتالیف وترجمہ کرنا۔

۳- علمی کتابوں کے طبع واشاعت کا سامان کرنا۔'' (۲۴)

دارالمصنفین کے خاکے کو عملی شکل دینے سے پہلے اس کی آمدنی کا معقول بندوبست کرنا ضروری سمجھا گیا، اس کے لئے مولانا حمیدالدین فراہی نے حیدرآباد کا سفر کیا اور شبلی مرحوم کا ماہوار وظیفہ دارالمصنفین کے نام منتقل کرایا، پھر ۴ر جولائی ۱۹۱۵ء کو لکھنؤ میں دارالمصنفین کے نام کی رجسٹری کرائی اور مئی ۱۹۱۵ء سے باقاعدہ دارالمصنفین کا آغاز ہوا (۲۵) اور وہاں سے سب سے پہلے مولانا سید سلیمان ندوی کی تالیف ''ارض القرآن'' اور ''مکاتیب شبلی'' شائع ہوئیں۔ (۲۶) اس وقت اس کا عملہ کل پانچ افراد پر مشتمل تھا، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا معین الدین احمد ندوی (بہاری) اور ایک مسودہ نویس، شعبۂ تصنیف وتالیف میں صرف

مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی تھے۔ انھیں بزرگوں کی کوشش اور خلوص کا نتیجہ ہے کہ دارالمصنفین کو بین الاقوامی حیثیت اور شہرت حاصل ہوئی۔

دارالمصنفین نے اپنا اشاعتی کام اگرچہ مذہبی کتابوں سے شروع کیا تھا، مگر شبلی کی صالح روایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے رفقاء نے ادبی کاموں کو کبھی فراموش نہیں کیا، اس سلسلے کی سب سے پہلی کتاب مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کی ''شعرالہند'' ہے، شعرالہند کی اشاعت کے بعد سے آج تک دارالمصنفین سے اردو اور فارسی ادبیات پر کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں، چونکہ ان کتابوں نے اردو دنیا کو اعلیٰ اور ستھرا ذوق بخشنے میں کارنمایاں انجام دیا ہے اس لئے ہم آئندہ سطور میں دارالمصنفین کی ان تمام ادبی کتابوں کا ایک مختصر مگر جامع مطالعہ پیش کریں گے جو اردو ادبیات کے مطالعے کے لئے مخصوص ہیں، تا کہ یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ اردو دنیا کی تہذیبی پیش رفت میں دارالمصنفین کا کیا حصہ رہا ہے؟

☆☆☆

حواشی:

(۱) الطاف حسین حالی، حیات جاوید، ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۹ء، ص ۱۰۰۔
(۲) الطاف حسین حالی، حیات جاوید، ص ۹۲۔
(۳) ڈاکٹر سید عبداللہ، سرسید اوران کے نامور رفقاء، چمن بکڈ پو، مٹیا محل دہلی ۱۹۶۰ء، ص ۳۰۔
(۴) الطاف حسین حالی، حیات جاوید، ص ۳۳۰۔
(۵) سید عابد حسین، ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۶۴ء، ص ۳۹، ۴۰۔
(۶) الطاف حسین حالی، حیات جاوید، ص ۵۴۳۔
(۷) مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۳ء، ص ۱۸۔
(۸) مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۳۵، ۳۶۔
(۹) مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۲۹۰، ۲۹۱۔
(۱۰) مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۲۹۲، ۲۹۳۔
(۱۱) مکاتیب شبلی، حصہ اول، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء، ص ۲۴۸۔
(۱۲) الہلال کلکتہ، ۱۱ر فروری ۱۹۱۴ء
(۱۳) مکاتیب شبلی، حصہ دوم، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء، ص ۱۹۳۔
(۱۴) مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۲۰۸۔
(۱۵) ایضاً، ص ۲۰۹۔
(۱۶) ایضاً۔
(۱۷) مکاتیب شبلی، حصہ دوم، ص ۱۲۷۔
(۱۸) ایضاً، ص ۱۲۸۔
(۱۹) مکاتیب شبلی، حصہ دوم، ص ۱۳۸۔
(۲۰) ایضاً، ص ۱۱۶۔
(۲۱) مکاتیب شبلی، حصہ دوم، ص ۱۱۶، ۱۱۷۔
(۲۲) مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۲۹۸۔
(۲۳) مکاتیب شبلی، حصہ دوم، ص ۱۳۲۔
(۲۴) البصیر، شبلی نمبر، حصہ اردو، پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور، ۱۹۵۷ء، مضمون سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۴۔
(۲۵) شاہ معین الدین احمد ندوی، حیات سلیمان، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء ص ۱۰۰۔
(۲۶) ایضاً۔

مکاتیب شبلی

اردو مکتوب نگاری نے فارسی کی آغوش شفقت میں آنکھیں کھولیں اس لئے فطری طور پر اس کا ابتدائی دور ایک طرح سے فارسی مکتوب نگاری کی تقلید ہے، اس زمانے میں فارسی میں لمبے چوڑے القاب وآداب لکھے جاتے اور پر تکلف، تصنع آمیز اور مقفیٰ و مسجع عبارت میں اپنا مافی الضمیر بیان کیا جاتا اردو مکتوب نگاروں نے بھی یہی روش اختیار کی، غالب پہلے مکتوب نگار ہیں جنھوں نے اس رسم کہن سے بغاوت کر کے ایک نئی طرز ایجاد کی، انھوں نے مکتوب نگاری کو تمام تکلفات سے پاک کیا اور سیدھے سادے انداز مین خط لکھ کر اردو مکتوب نگاری کو ایک نئے طرز سے آشنا کیا، چنانچہ ان کا یہ انداز بہت پسند کیا گیا اور ان کے خطوط مقبول ہونے لگے، اس کے بعد اردو کے تمام مکتوب نگاروں نے اسی طرز نو کو اپنے لئے مشعل راہ بنایا اور سیدھے سادے انداز میں خطوط لکھے جانے لگے، سرسید کے دور میں غالب کے اختیار کردہ طرز کو اپنانے کی طرف خاص طور سے توجہ دی گئی، سرسید، محسن الملک، وقار الملک، شبلی، آزاد، حالی، اکبرالہ آبادی، امیر مینائی اور داغ وغیرہ نے اس طرز کا اتباع کیا، اور ان کے بعد بھی یہ روش برقرار رہی۔

ان میں شبلی کے خطوط اپنی تازگی، شگفتگی، صفائی اور برجستگی کی وجہ سے خاص اہمیت کے حامل ہیں، ان کے وہ خطوط جو انھوں نے اپنے احباب اور شاگردوں کو لکھے تھے دارالمصنفین نے ''مکاتیب شبلی'' کے نام سے دو جلدوں میں شائع کر دیئے ہیں، ان مکاتیب میں علم وفن کے تذکرے، شعر وادب پر مباحث، تصنیف وتالیف سے دلچسپی، تحقیق وتدقیق کے مسائل، تنقید وتبصرہ، مطالعہ کا شوق، مذہبی جوش وخروش، عزیز واقربا سے محبت، سیر وتفریح، شوخی وظرافت، رنج ومسرت اور طنز وتعریض کے چھینٹے، الغرض شبلی کی رنگارنگ شخصیت کے تمام جلوے صاف نظر آتے ہیں، اور ان کے ذہنی وفکری رجحانات اور قومی وملی مسائل سے گہری دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے، شبلی کی مکتوب

نگاری پر نظر ڈالتے ہوئے پروفیسر خورشید الاسلام یوں رقم طراز ہیں۔

"شبلی کے خطوط میں، قومی شعور کے گہرے سائے، ادبی دلچسپیاں، کتابوں پر تبصرے، کشمیر کی فضائیں، جذبات کی برانگیختگی، اور عورتوں کا حسن، موسیقی اور مصوری کیا نہیں ہے؟ خزاں ان کے ہاتھ میں جا کر بہار بن جاتی ہے، ان کے خطوط میں پندار ہے، چشمکیں ہیں، لطیف اشارے ہیں، کہیں پردے گرتے ہیں اور اور کہیں اٹھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔" (۱)

خطوط شبلی کی بنیادی خصوصیات یہ ہیں کہ شبلی، غالب کی طرح القاب و آداب کی پرواہ نہیں کرتے، سلام و دعا کے فوراً بعد مطلب کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، خط مختصر لکھتے ہیں مگر اس ایجاز و اختصار میں مقصد کی وضاحت اور معنی کی وسعت موجود ہوتی ہے، یہی چیز ان کی مکتوب نگاری کی جان ہے، ان کا ہر لفظ سانچے میں ڈھلا ہوا اور عجب طرح کی تاثیر سے معمور ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اس کی لذتوں میں کھو جاتا ہے، ان کے خطوط کی نمایاں خصوصیت مخاطبوں کے رتبہ و مقام کا لحاظ ہے، وہ ان کے جذبات و نفسیات کا پورا خیال رکھتے ہیں اور ہر ایک کو اس کے ذوق و شوق کے مطابق خط لکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے خطوط مستقل قدر و قیمت کے مالک تصور کیے جاتے ہیں، مکاتیب شبلی کے مقدمہ میں مولانا سید سلیمان ندوی نے شبلی کی خطوط نویسی کی جو خصوصیات بتائی ہیں وہ یہ ہیں۔

۱- "نہایت مختصر لکھتے تھے، کبھی کبھی صرف "ہاں"، "ناں" پر اکتفا کرتے تھے، مفصل اور طویل سوالوں کا جواب بھی ایک دو فقروں میں دیتے تھے۔

۲- لیکن درحقیقت مختصر نویسی کوئی ایسی خوبی کی بات نہیں، اصل خوبی یہ ہے کہ اختصار لفظ کے ساتھ معنی میں پوری وسعت موجود ہو، یہی خصوصیت انشا پردازی اور بلاغت کی جان ہے، وہ ان ہی ایک دو فقروں میں جو کچھ کہہ جاتے ہیں، ہم صفحوں میں ان کو نہیں کہہ سکتے۔

۳- القاب و آداب کی پرواہ نہیں کرتے تھے، اکثر بلا تمہید مطلب شروع کر دیتے تھے۔

۴- خطوط کے جواب نہایت پابندی کے ساتھ اور نہایت جلد بلکہ اسی دن لکھتے تھے، بیماری تک میں بھی وہ اس وضع داری کو نبھاتے تھے، بہت مجبور ہوتے تو دوسروں سے لکھا دیتے۔

۵- ابتداءً مولانا کا خط شکستہ تھا، پھر خوشخط، نستعلیق لکھنے لگے تھے، آخر میں شکستہ اور نستعلیق

مل کر ایک عجیب خوش سواد خط پیدا ہو گیا تھا۔

۶- مولانا ہر شخص سے اس کے مذاق اور تعلقات کے مطابق گفتگو کرتے تھے، شاگردوں کے خطوط میں علمی و اصلاحی مشورے نظر آئیں گے، مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے خطوط میں فارسی شاعری، نوادر کتب اور ندوہ کے متعلق باتیں ہیں، پروفیسر عبدالقادر سے ادب تاریخ فارسی کے مباحث پر گفتگو، مولانا حمید الدین صاحب سے تفسیر اور سیرت پر مکالمات ہیں، مسٹر عبدالماجد سے ''مغربیات کی باتیں ہیں، مسٹر مہدی حسن صاحب مصنف دائرۂ ادبیہ کے نام کے خطوط میں ''محاسن ادبی'' اور ''لطافت شعری'' پر گلفشانیاں ہیں۔'' (۲)

شبلی کے اکثر خطوط میں غالب کی بے ساختگی، برجستگی اور انداز تخاطب کا انوکھا پن ملتا ہے وہ چھوٹے چھوٹے فقرے لیکن اس طرح سادہ اور بے تکلف لکھتے جیسے غالب ہی کی طرح ''مراسلہ کو مکالمہ'' بنا رہے ہوں، مثلاً مولوی محمد سمیع کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''امتحان سے آئے، کہو سوالات کیسے تھے، جواب کیسے لکھے، افسوس کہ جلسۂ انعام میں تمہیں نہ تھے۔ مگر مجبوری تھی، کیا کہئے لڑکوں نے ماسٹر کو برا بنا دیا ورنہ حکام کو بہت زیادہ نظر لطف تھی، ماسٹر کی تلاش میں ہوں، دیکھو شب و روز مدرسہ کی فکر رہے، ذرا قوم کو ابھار دو۔'' (۳)

اسی طرح ایک دوسرے خط میں مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھتے ہیں۔

''کالج تو ابھی بند ہے، میں عید کی صبح کو چلوں گا، وہیں جو کچھ کہئے گا کروں گا، میاں عبدالباری کے معاملہ میں کس کا قصور ہے، پبلک سے کسی کی سفارش کرنا اس وقت بہت آسان ہوتا ہے، جب خود اس نے بھی پبلک میں پیش کیا ہو۔'' (۴)

ایک جگہ مولانا شاہ سلیمان پھلواروی کو لکھتے ہیں۔

''اللہ اکبر، آپ دارالعلوم کے لئے چندہ مانگیں تو کس کو انکار ہوگا۔

غازی چو توئی رواست کافر بودن

بے شبہ علاج کے لئے لکھنؤ آ سکتا تھا، لیکن میرے خاص عادات ہیں، جن کے بغیر

میں بسر نہیں کر سکتا تھا۔'' (۵)

شبلی کا ایک خط تو ایسا ہے جس کو پڑھ کر غالب کا وہ خط یاد آتا ہے جو انھوں نے لکھا تو میر مہدی کو تھا مگر پہلی نظر میں اس کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ خط میرن صاحب کے نام لکھا جارہا ہے (۶)۔ شبلی نے محمد سمیع کے نام ایک خط میں بھی یہی انداز اختیار کیا ہے۔ اور لطف دوبالا کرنے کے لئے افراد کی تعداد میں اضافہ کر کے ایک ڈرامہ سا تصنیف کر دیا ہے، اس خط کے چند جملے یہ ہیں:

''بھئی کچھ سنا ہے، (محمد سمیع) خیر تو ہے، ہاں ایک تازہ واقعہ ہے میاں شبلی کا انتقال ہو گیا (محمد سمیع) ارے سچ نہیں جھوٹ ہوگا، ابھی ہفتہ بھی نہیں ہوا، ان کا ایک خط میرے نام آیا تھا، (مولوی محمد عمر صاحب) لو تم نے آج سنا ہے، اجی اس کو تو کئی دن ہوئے، انھوں نے جو کتابیں بھیجی تھیں، اس کی رسید بھی تو میں نے اسی وجہ سے نہیں دی، (محمد سمیع) اناللہ! افسوس ابھی مرنے کے کوئی دن تھے، (حمید) ہاں واقعی سخت رنج ہے، مگر تقدیر سے کس کا زور چلتا ہے (اور دبی زبان سے) ارے میاں چلو قصہ پاک ہوا، آئے دن کی حکومتوں سے دم ناک میں آ گیا، بھلا روئداد خیر ایک بار کا کام تھا، لکھ بھی لیا، اب روز روز مدرسہ میں لڑکوں کو مسودہ لکھاتے پھرو، اس پر طرہ یہ کہ ہفتہ وار مدرسہ کی رپورٹ لکھ کر ان کے پاس بھیجتے رہو، اچھی خاصی بیگاری بھگتا کرو، (عبدالغفور) ارے میاں خیر مرنا تو سب کے لئے ہے، ہاں ان کے خط کا جواب رہ گیا، مگر یہ بھی کوئی زبردستی ہے، جی نہ چاہے تو مفت کی محنت کون گوارا کرے، (حافظ حسن علی صاحب) لو اب کی ان کو خط لکھتے لکھتے رہ گیا، امتحان کا حال لکھنا تھا، اور جو کچھ ہو، آدمی تو مزے کا تھا، دو گھڑی کیفیت رہتی تھی، (مولوی محمد عمر صاحب) بھئی کیا کہئے دل لگی ہی جاتی رہی، اور تو کس کام کا آدمی تھا، مگر ہاں ذرا جی بہل جایا کرتا تھا، (مولوی احمد اللہ) اجی جی کیا بہلتا تھا، دنیا بھر کی شکایتیں ہوا کرتی تھیں، کبھی ان کی نقل کی، کبھی ان کا خاکہ اڑایا، اور اس کے سوا ان کا کام ہی کیا تھا، چلو اچھا ہوا۔'' (۷)

شبلی ایک جید عالم، دقیقہ رس فاضل، ماہر ادبیات، بلند پایہ مورخ، محقق، نقاد، شاعر و ادیب غرض سب ہی کچھ تھے، ان کے مزاج میں بلا کی شوخی اور تیزی بھی تھی، لیکن طبیعت کا یہ رنگ ان کی تصنیفات میں نہیں کھلتا، دراصل انھوں نے تصنیف و تالیف کے لئے جن موضوعات کو منتخب کیا

وہ متانت اور سنجیدگی کے متقاضی تھی، ان میں شوخی و ظرافت کی گنجائش نہ تھی، البتہ شاعری میں ظرافت کے نمونے کہیں کہیں ملتے ہیں، خطوط میں تو اور کوئی پردہ حائل نہیں ہے، لوگوں سے کھل کر ملتے ہیں اور ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہیں، لیکن اس ہنسی مذاق میں عامیانہ پن نام کو بھی نہیں آنے پاتا، یہی چیز ان کے خطوط کو حسن اور دلکشی عطا کرتی ہے مثلاً ایک خط میں دوستوں کے خط نہ لکھنے کا شکوہ اس طرح کرتے ہیں:

"مدت سے کوئی خط نہیں آیا، ہمارے مولوی محمد عمر صاحب تو ۔

ع: گویا کہ ان تلوں میں کبھی تیل ہی نہ تھا

میاں حمید صاحب تو خفا ہو بیٹھے ہیں، میاں عبدالغفور نے سمجھ رکھا ہے کہ دوست کا دشمن دشمن ہوتا ہے، تم بھی چپ ہو، مولوی صاحب کے پاس اشعار جو بھیجے تو تقویم پارینہ، میرا مرثیہ، یا نامہ فارسی بھیجنا تھا۔"(۸)

ایک دوسرے خط کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

"اچھا ذرا سلاموں کا پشتارہ تو سر پر لے لو، اور سب کے حصہ کا تقسیم کر آؤ، جناب حافظ حبیب اللہ صاحب، جناب حافظ حسن علی صاحب، جناب منشی خدا بخش صاحب (بوڑھے تو شاید ہو لیے چلو اب جوانوں سے شروع کرو) مولوی احمد اللہ صاحب فخر الملت والدین کہیں "ف" اڑا نہ جانا، منشی حسن رضا خان صاحب، منشی ولی جان صاحب، ہماری شادی ٹھہراتے ہی رہ گئے، میاں خادم حسین صاحب سے سخت غلطی ہوگئی، ان کا نام کسی کے نام کے ساتھ ملا کر یا نیچے لکھنا تھا، اگرچہ ٹاٹ میں مونج کا بخیہ سمجھا جاتا، مکرمی مولوی محمد عمر صاحب کیا خطوں کا جواب نہیں دیتے تو سلام کا جواب بھی نہ دیں گے، افتخار القوم حضرت ماموں محمد سلیم صاحب دام فیضہ علینا، مولوی محمد حسین صاحب مگر جانے وہ کہاں ہوں، میرا سلام مفت میں خاک چھانتا پھرے، کوئی بھول تو نہیں گیا، آہا مرزائے مختصر میاں سلیم اللہ صاحب رہ گئے، اتنا سا تو قد مجمع میں نظر آئیں تو کیونکر ایک اور میرا مایۂ فخر و ناز رہ گیا، جناب مولوی مرزا محمد سلیم صاحب خیر ان ہی کے صدقے مرزائے مختصر بھی یاد آگئے تھے۔"(۹)

اردو کے مشہور انشاپرداز اور مولانا کے مخلص دوست جناب ایم۔مہدی حسن صاحب کے نام ایک خط کا یہ اقتباس اور ملاحظہ فرمایئے:

''آپ کے احرام جدید(۱۰) کی داد دوں یا رشک کروں، ہاں بمبئی جاتا ہوں، شرط یہ ہے کہ خود گاڑی تک آکر لواجائیں، کچھ ایسی بڑی بات نہیں، کوئی کیوں رشک کرے؟ قاضی صاحب(۱۱) ہمارے کام کے آدمی نکلے، نیچا سنتے ہوتے تو خوش صحبت بھی تھے، جوان ہوتا تو ان سے باتیں کر لیتا، بڑھاپے میں اذان دینا ذرا مشکل ہے، ایک ماہوار رسالہ نکالنا چاہتے ہیں، وہ بھی پولیٹکل علی گڑھ کی خدائی کا بھی ڈر نہیں۔''(۱۲)

ایسے متعدد خطوط ان کے مجموعے میں موجود ہیں جن کو پڑھ کر طبیعت کو سرور وانبساط حاصل ہوتا ہے، اس کے علاوہ شبلی نے اپنے بعض خطوط میں طنزیہ لب ولہجہ بھی اختیار کیا ہے بالخصوص جب وہ اپنے مخالفین یا معاصرین کا ذکر کرتے ہیں تو دو ایک فقرے ایسے چست کر جاتے ہیں جن میں بلا کی تیزی اور نشتریت ہوتی ہے، ان کا طریقۂ طنز بھی بڑا دلآویز ہوتا ہے بظاہر تو وہ اپنی ذات پر وار کرتے ہیں مگر نشانہ کہیں اور ہوتا ہے، مثلاً حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''باوجود اس کے میں اس کمیٹی سے خارج رکھا گیا ہوں، رسالہ میں مجھ کو دخل نہیں تو کیا مجھ سے دعا گوئی اور طبل نوازی کا کام لینا مقصود ہے۔(۱۳)

اسی طرح نواب محسن الملک کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''مولوی صاحب روپیہ اور دولت کی قدر مجھ سے زیادہ کسی کو نہیں، میں کچھ ابراہیم ادہم یا بایزید نہیں ہوں، میرا تو رواں رواں دنیا کی خواہشوں سے جکڑا ہے، لیکن دنیا کو سلیقہ کے ساتھ حاصل کرنا چاہتا ہوں، مجھ سے جوڑ، توڑ، سازش، درباداری، خوشامد، لوگوں کی جھوٹی آؤ بھگت نہیں ہوسکتی، اور بغیر اس کے کامیابی معلوم۔''(۱۴)

زمانۂ قدیم سے خطوط میں اشعار لکھنے کا رواج چلا آرہا ہے، یہ خصوصیت بیشتر مکتوب نگاروں کے یہاں ملتی ہے، چنانچہ شبلی بھی اپنے اکثر خطوط میں اشعار استعمال کرتے ہیں، وہ کبھی کبھی خط کی ابتدا ہی کسی عمدہ اور لطیف شعر سے کرتے ہیں اور اپنے اصل مقصد کو اس سے منسلک کر دیتے ہیں، کبھی محض ایک مصرعہ لکھ کر مدعا بیان کرتے ہیں، کبھی کبھی درمیان میں کوئی شعر لکھ دیتے ہیں یا اپنا

خط کسی شعر یا مصرعے پر ختم کرتے ہیں، اس قسم کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

مولوی محمد سمیع کے نام کے ایک خط کی ابتدا اس شعر سے کرتے ہیں۔

دوستو نذر ہیں یہ لعل و گہر تھوڑے سے
اشک خوں تھوڑے سے اور لخت جگر تھوڑے سے (۱۵)

مولوی محمد سمیع ہی کے نام دوسرے خط کی ابتدا یوں کرتے ہیں:

''عزیزی،

میں یہاں آ کر ایسا پھنس گیا کہ، مصرع :

نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

ہمت کہتی ہے، مصرع :

بے تامل آستین افشاندن از دنیا خوش است

مصلحت فریب دیتی ہے کہ تم میں اور بہت سے لوگ شامل ہیں، ان کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے۔''(۱۶)

ایک جگہ اپنے بھائی محمد اسحٰق کے خط کے درمیان میں فارسی کا یہ شعر لکھتے ہیں:

''تم کو اسکول کا خیال نہیں، شفیع کو درد نہیں، میاں شوکت کو ہمدردی کی کوئی وجہ نہیں۔

در چمن از کہ مراعات ادب داری چشم
بلبلان مست و صبا بے خود و گل بے پروا (۱۷)

مولانا ابوالکلام آزاد کے نام کے خط کا اختتامیہ بھی قابل دید ہے۔

''اگر آپ اس موقع پر نہ آئے تو میں قیامت تک کلکتہ نہ آؤں گا، بلکہ بعد قیامت بھی۔ میرے برابر کا کمرہ بالکل خالی اور آپ کے لئے محفوظ ہے، اکثر احباب آ رہے ہیں، اور آ چکے ہیں،

دیر ویراں سہی کعبہ مرا آباد رہے
یعنی مومن ہوں چلا جاؤں گا میں یاد رہے (۱۸)

مولانا ابوالکلام آزاد کے نام کئی خطوط ایسے ہیں جن میں شبلی نے محض کوئی شعر لکھ کر اپنا مدعا

بیان کیا ہے، اس کے علاوہ خطوط شبلی کی اس لئے بھی اہمیت ہے کہ انھوں نے اپنے خطوط میں تصنیف وتالیف کے مسائل سے بحث کی ہے، دراصل ان کے پیش نظر ایک وسیع مقصد تھا، وہ ملک میں مصنفین کی ایک اعلیٰ جماعت پیدا کرنا چاہتے تھے، اس مقصد کی بازیابی کے لئے انھوں نے ذہین اور ہونہار طلبا کو جمع کر کے تصنیف وتالیف کی عملی تربیت دی، جب تک ندوہ میں قیام پذیر رہے ان کو موضوع دے کر مضامین لکھواتے اور تلخیص وترجمہ کی ہدایت کرتے، حسب ضرورت ان کی اصلاح کرتے اور مناسب حال نکتے بتاتے، مضمون کو عام فہم بنانے کی پوری تاکید کرتے، اگر انھوں نے اپنے قابل اور باصلاحیت شاگردوں کی تربیت اس دقت نظر سے نہ کی ہوتی تو ان کا سیرت نبوی کی تالیف کا دیرینہ خواب شاید کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکتا، کیونکہ اس کی تالیف کا ابھی ابتدائی مرحلہ ہی تھا کہ شبلی اللہ کو پیارے ہوگئے لیکن یہ ان کی تربیت ہی کا اعجاز تھا کہ ان کی وفات کے بعد اس عظیم الشان منصوبہ کو ان کے لائق شاگردوں نے اس اہتمام اور دقیقہ رسی سے پورا کیا کہ اس سے بہتر کی توقع نہیں کی جاسکتی، عام طور سے طلبا کی تربیت اور رہنمائی کے لئے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود شبلی کچھ وقت فارغ رکھتے اور ان کو پاس بلاکر مفید مشورے دیتے، مگر جب کبھی ان سے دور ہوتے تو یہ فرائض خطوط کے ذریعہ انجام پاتے، مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''تم عرب بائدہ، یا عرب کی ان مہذب سلطنتوں کے پیچھے نہ پڑو، جو یمن، شام وغیرہ میں قائم تھیں، ان کے متعلق چند صفحات میں اجمالی بحث کافی ہوگی، تمام کوشش، نجد، حجاز، یثرب کے متعلق معلومات کے جمع کرنے میں صرف کرنی چاہئے، تم ان ہی مقامات کے متعلق مزید معلوم بہم پہنچاؤ، آبادیٔ کعبہ اور حضرت ابراہیمؑ وحضرت اسماعیلؑ کے واقعات میں جس قدر تفصیل مل سکیں، تحقیق وتلاش کرو۔

۲-عبدالوہاب نجدی کی کتاب الہدی النبوی کے چند صفحات کی نقل بھیجو، تو میں اس کے متعلق رائے قائم کرکے اس کی نقل کی اجازت دوں۔

۳-تاریخ الاسلام الابراہیم بن عبداللہ کی جو عبارت تم نے نقل کی ہے، اس میں کوئی نئی بات نہیں، یہ باتیں اور کتابوں میں مذکور ہیں، صرف یہود سے جزیہ نئی بات ہے، لیکن اس کا ثبوت نہیں۔'' (۱۹)

مولانا سید سلیمان ندوی کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

''دونوں پرچوں میں تمہارا مضمون بہت اچھا نکلا، اب تم کو تصنیفی سلیقہ آ چلا، البتہ عبارت کی ابھی تک کمزوری باقی ہے، وہ بھی جاتی رہے گی۔'' (۲۰)

مولانا مسعود علی ندوی کے نام ایک خط میں مولانا عبدالسلام ندوی کو یہ ہدایت کرتے ہیں۔

''عبدالسلام قرآن مجید کو ایک طرف سے پڑھنا شروع کریں، جو آیت جس مد میں آئے الگ کاغذ پر اس عنوان کے تحت میں لکھتے جائیں۔ ان الفاظ کو بھی یکجا کرنا چاہئے جو قرآن کے اصطلاحی الفاظ ہیں، مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ، منافق، مومن، رکوع، سجود، وغیرہ، یعنی قرآن مجید نے زبان میں کتنے اصطلاحی الفاظ اضافہ کیے۔'' (۲۱)

ایک دوسرے خط میں مولانا عبدالسلام ندوی کو لکھتے ہیں:

''سیرت میں سے تم چند ممتاز یہودیوں کے قتل یعنی کعب بن اشرف وغیرہ جو ابتدائے ہجرت میں قتل کرائے گئے، ان روایتوں کو تہذیب التہذیب وغیرہ سے اور اصول و روایت سے جانچو، مولوی چراغ علی نے اس پر ایک خاص رسالہ لکھا ہے، لیکن اس کی تنقید کی حاجت ہے۔ جو یہاں نہیں ہو سکتی، دوسرے یہ کہ انھوں نے صحابہ کو بوجہ صغرسن نا قابل اعتبار بتایا ہے، یہ کافی نہیں۔'' (۲۲)

مندرجہ بالا خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ شبلی نے اپنے شاگردوں کی تربیت بڑی جانفشانی سے کی، درحقیقت اس کی بدولت مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی وغیرہ نے تصنیف و تالیف میں نمایاں مقام حاصل کیا اور علم و ادب کے افق پر مہر و ماہ بن کر چمکے۔

مولانا شبلی کے بارے میں ایک جگہ مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''مولانا کی عظمت کے لئے یہی کیا کم تھا کہ وہ اردو کے عظیم ترین مصنفوں میں سے ایک ہوئے ہیں، لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ وہ مصنف گر تھے، ایک مجسم ٹکسال تھے جس سے مصنف اور اہل قلم ڈھل ڈھل کر نکلتے رہے۔'' (۲۳)

ادبی دنیا میں شبلی کے خطوط کو اس لئے بھی اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے اپنے خطوط میں علم و ادب کے مختلف رموز و نکات پر روشنی ڈالی ہے، ان کو فارسی زبان و ادب پر گہری دسترس تھی،

جب معاصرین اور شاگردوں کو کسی مقام پر کوئی دقت محسوس ہوتی تو خط لکھ کر ان سے رجوع کرتے، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اپنے فارسی اشعار بغرض اصلاح ان کے پاس بھیجا کرتے تھے شبلی اشعار کی نوک پلک درست کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو مفید مشورے بھی دیتے اور شاعری کی لطافت ونزاکت کے باریک نکتوں سے بھی آگاہ کرتے۔ اس قسم کے خطوط کو دیکھنے سے ایک طرف تو شبلی کی تنقیدی قوت اور بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے تو دوسری طرف ان خطوط کا مطالعہ ہماری معلومات اور علم میں اضافہ کرتا ہے مثال کے طور پر حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام یہ خط ملاحظہ فرمایئے:

''غزل دیکھی، بعض شعر بہت اچھے ہیں، مثلاً ''چوں آشنا نگہے کرد، الخ جو الفاظ بیکار اور بھدے ہیں، ان پر خط کھینچ دیا ہے، ''ضیائے شمع تراشب چراغ ویرانہ، '' محض شمع ہونا چاہئے اور ضرورت ہی ہو تو ''ضیاء'' کے بجائے ''فروغ'' ہونا چاہئے، ''دیدۂ مخمور'' کے بجائے ''نرگس مخمور'' ہونا چاہئے، ''انداز ناز جانانہ'' یا نہیں کہ ''انداز'' کے جو معنی اردو میں ہیں، فارسی میں بھی آئے ہیں، یہ ''قلب خویش'' ''قلب'' کا لفظ بہت بھدا ہے، یہ ''صف لشکری'' ''ی'' بالکل ناجائز ہے، محض لشکر کہئے، عروض کی رو سے بھی جائز ہے''۔ (۲۴)

اسی قسم کا ایک دوسرا خط دیکھئے:

''اب نکتہ چینی کی خدمت ادا کرتا ہوں۔

خوشم انداز قد سروپا در گل نمی آید

خوشم پیچھے آتا تو اچھا ہوتا، قد کا لفظ بھی کچھ ضروری نہیں، اس کے نکلنے سے تو الٹی اضافات کا بار بھی ذرا کم ہو جائے گا۔

بہ پہلو یم رواں آن سرو خوش رفتار بایستی

پہلو میں چلنا ٹھیک نہیں، سامنے سے گزرنا چاہئے، کیا خوب کہا ہے ۔

گاہ گاہ از نظرم مست وغزل خواں بگذر ☆ ورنہ بر عہدۂ من نیست کہ رسوا باشم

بآغوش بتے بودی و بابردار بایستی

واؤ کو اس طرح متحرک لانا فردوسی تک ختم ہو چکا ہے، اب جائز نہیں، مقطع کا آخر مصرع رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔'' (۲۵)

یوں تو مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی غزل ہی لکھتے تھے، مگر جب طبعی میلان میں تغیر پیدا ہوا تو نعت گوئی کی طرف متوجہ ہو گئے، شبلی نے ان کو اس کوچہ میں قدم رکھنے سے منع کیا اور فرمایا:

''علمائے ادب کہتے ہیں کہ حسانؓ جاہلیت کے نامور شعراء میں تھے، لیکن اسلام آیا اور نعت کہنی شروع کی، تو ان کا کلام رتبہ سے گر گیا، فارسی میں دیکھئے، نعت گو بہت کم چھپلے ہیں، خسرو کے سوا اور خیر جامی بھی سہی، باقی جتنے ہیں نہایت کم رتبہ ہیں، اور صاف نظر آتا ہے کہ نعت گوئی نے ان کو ایسا بنا دیا ہے، سچ ہے

رہ بر دم تیغ است قدم را، مقصود اس دراز نفسی سے یہ ہے کہ آپ بھی اس میدان میں نہ آیئے۔ ثواب مقصود ہے تو درود پڑھ لیا کیجئے، معاف فرمایئے، نعت کی غزل صرف پھیکی نہیں بلکہ غلطیوں سے مملو ہے۔'' (۲۶)

ایک دوسرے خط میں شروانی صاحب کو انتخاب طرح کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''آپ جو طرحیں اختیار کرتے ہیں وہ مقید اور محدود ہوتی ہیں، آپ کو قافیہ اور ردیف کے نباہنے کے لئے شعر کہنے ہوتے ہیں، طرحیں ایسی لیجئے کہ جو خیال دل میں بے تکلف بندھ جائے، یا ایسی شگفتہ کہ جو شعر نکلے خواہ مخواہ رواں اور برجستہ ہو۔'' (۲۷)

شبلی کے خطوط علمی وادبی تذکروں سے بھرے ہوئے ہیں، انھوں نے ہندوستان کے تمام مشہور کتب خانوں کو کھنگال ڈالا تھا، جب اس سے بھی پیاس نہ بجھی تو ترکی کا سفر کیا اور قسطنطنیہ کے کتب خانون سے استفادہ کیا، ان کے خطوط میں نایاب و نادر کتابوں کا ذکر کثرت سے ملتا ہے، اکثر کے متعلق انھوں نے اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے اس کی اہمیت اور افادیت پر بھی روشنی ڈالی ہے، اس لحاظ سے ان کے خطوط بڑے اہم ہیں، ان کے مطالعہ سے شائقین علم وادب کے ذوق کی محض تسکین ہی نہیں ہوتی بلکہ نئی نئی معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں، مثلاً حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اعجاز خسروی کا ایک عجیب وغریب نسخہ ہاتھ آیا، امیر کی وفات کے دس برس بعد کا لکھا ہوا ہے، نہایت صحیح اور سرتا پا محشیٰ ہے اور کمال یہ کیا ہے کہ لفظی رعایت میں ایک لفظ کے کئی ٹکڑے میں بھی کوئی رعایت ہے تو اس قدر ٹکڑا سرخ لکھا ہے، مثلاً باغ کی رعایت

میں بو کا لفظ آ گیا ہے تو بو کو سرخ لکھا ہے، تمام کتاب میں یہ التزام ہے اس قدر دیدہ ریزی شاید خود مصنف نے کی ہو۔" (۲۸)

شروانی صاحب کے خط میں ایک رسالے کی اشاعت اور اس کی خصوصیت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

"مصر میں ایک پرچہ اسلام کے ثبوت اور فلسفۂ حال کی تطبیق پر نکلا ہے، اور ماہوار نکلتا ہے، زور کا پرچہ ہے اور واقعی عمدہ ہے، ایڈیٹر فرنچ و جرمن زبان کا ماہر ہے، میں نے منگوایا ہے، اور مسلسل آ رہا ہے، ماہوار ہے، لیکن صفحے کم ہوتے ہیں۔" (۲۹)

ان سب باتوں کے علاوہ شبلی کے خطوط میں ان کی انشا پردازی بھی اپنے تمام جلووں کے ساتھ نمایاں ہے، علاوہ بریں ان کے خطوط کا اسلوب دلچسپ و دلکش ہونے کے ساتھ ساتھ فصیح و بلیغ بھی ہے، اور جدت و لطافت اور سادگی و پرکاری کا نمونہ بھی، شبلی اپنی بات کو سیدھے سادے انداز میں بلا تکلف اور دلچسپ پیرایہ میں بیان کرتے ہیں اور ہر موقع و محل کے لحاظ سے اسی کے مطابق طرز تحریر کا انتخاب کرتے ہیں، اسی وجہ سے ان کے خطوط میں عبارت کی صفائی، سلاست و روانی اور نزاکت و شگفتگی ملنے کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں لطیف و نازک تشبیہ و استعارہ بھی دکھائی دے جاتے ہیں، جن سے ان خطوط کا ادبی حسن اور نکھر جاتا ہے، بقول ڈاکٹر سید عبداللہ "ان کا ہر خط ایک زعفران کا پھول ہے، جس میں باغ فردوس کی خوشبو ہے"۔ (۳۰) گو کہ یہ خطوط اشاعت کے لئے نہیں لکھے گئے تھے اور ان کی نوعیت محض ذاتی تھی، لیکن اپنے دلکش طرز تحریر اور بے تکلف انداز بیان کی وجہ سے یہ نج کے خطوط بھی ادب پارہ بن گئے ہیں، شبلی نے اپنی روئداد سفر کو ایک خط میں قلم بند کیا ہے، یہ روئداد سفر کس طرح ادب پارہ بنتی ہے اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"کاٹ گودام تک ریل ختم ہوتی ہے، اور پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، کاٹ گودام سے نینی تال بارہ میل ہے، مگر تمام راستہ قدرت الٰہی کی نیرنگی و عظمت کا مرقع ہے، عرض میں پانچ چھ ہاتھ زمین چھوٹی ہوئی ہے، جس پر رستہ چلتا ہے، باقی ایک طرف پہاڑ کی وہ ہیبت ناک دیوار ہے، جس کی طرف دیکھنے سے نگاہ کانپ جاتی ہے، دوسری جانب

نہایت عمیق ہولناک غاروں کا سلسلہ ہے اور اگر اس پہاڑ میں سخت سردی نہ ہوتی تو یہ غار بڑے بڑے اژدر اور موذی جانوروں کے دارالسلطنت ہوتے۔"(۳۱)

ایک دوسرے خط میں عزیزوں کے خط نہ لکھنے کا شکوہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"بھئی سب نے خط نہ لکھنے کی قسم کھالی ہے، یا کسی منت پر روزہ سکوت رکھا ہے، آخر بات کیا ہے؟ مولوی محمد عمر صاحب الگ دم بخود ہیں، تم جدا خاموش ہو، مہدی نے اعظم گڑھ پہنچنے کی رسید تک نہیں لکھی، والد قبلہ کو کام سے کہاں فرصت، اس مہنگی میں بھائی مولوی محمد سعید صاحب کی دوسطریں اگر چہ صرف مطلب کی ہیں، غنیمت معلوم ہوئیں، کیا سنسان کا عالم ہے، گویا ان تلوں میں تیل ہی نہ تھا، خیر شکایت کیوں کیجئے، دوسرے پر زور کیا، جب گھر بار چھوٹے، عزیز آشنا چھوٹے، تو غربت میں کوئی کیوں کسی کا ساتھ دے، لو صبر آ گیا۔"(۳۲)

ابھی تک ہم نے مولانا شبلی کے خطوط کے جو اقتباسات نقل کئے ہیں ان سے اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ ایک طرف تو ان کے خطوط علمی و ادبی معلومات کا ذخیرہ ہیں تو دوسری طرف اپنے دلکش اور پرزور اسلوب بیان کی وجہ سے وہ ادب العالیہ کا نمونہ بن گئے ہیں، علاوہ بریں یہ خطوط ان کے اس وصف کو بھی واضح کرتے ہیں کہ وہ ایک بھرپور، متحرک اور فعال زندگی گزارنے کے متمنی تھے اور جہاں تک ان سے ہوسکا ہے انھوں نے دنیا کی انواع واقسام کی چیزوں کو ایک سیاح کی نظر سے بڑی دلچسپی اور شگفتہ مزاجی سے دیکھا اور دکھلایا ہے۔

شبلی کی شخصیت کا یہ موخر الذکر پہلوان کے ان خطوط میں زیادہ نمایاں ہے جو انھوں نے عطیہ بیگم فیضی اور زہرہ بیگم فیضی کے نام لکھے ہیں، اور جن کو محمد امین زبیری صاحب نے بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کے مقدمہ کے ساتھ "خطوط شبلی" کے نام سے شائع کیا ہے، چونکہ اردو زبان میں خواتین کے نام کے ایسے خطوط کا یہ پہلا مجموعہ تھا اس لئے اس پر خوب خوب خیال آرائی کی گئی، اور اس موضوع کو بہانہ بنا کر "شبلی کی رنگین زندگی" پر متعدد مضامین اور کتابیں لکھی گئیں، ڈاکٹر وحید قریشی نے "شبلی کی حیات معاشقہ"، شیخ محمد اکرام نے "شبلی نامہ" اور محمد امین زبیری نے "ذکر شبلی" کے نام سے کتابیں لکھ کر شبلی اور عطیہ بیگم فیضی کے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے چونکہ "خطوط شبلی" کی

اشاعت دارالمصنفین سے نہیں ہوئی ہے اس لئے ہم اس پر روشنی ڈالنے سے گریز کرتے ہیں، البتہ اس مقام پر یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر ابن فرید صاحب نے اپنے مقالے، شبلی چوں بہ خلوت می رود" (۳۳) میں ان تمام مقالوں اور کتابوں کا مدلل اور بھرپور جائزہ لے کر اس سلسلے کی ساری غلط فہمیاں دور کر دی ہیں اور اب اس موضوع پر مزید بحث کی گنجائش باقی نہیں ہے۔

☆☆☆

حواشی:

(۱) پروفیسر خورشید الاسلام، تنقیدیں، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، ۱۹۶۰ء، ص ۲۴)

(۲) مکاتیب شبلی (حصہ اول) مرتبہ: مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء، ص ۸

(۳) ایضاً، ص ۵۸

(۴) ایضاً، ص ۲۹۰

(۵) ایضاً، ص ۳۳۵

(۶) مرزا غالب بنام میر مہدی، خط نمبر ۵۴، عود ہندی، پبلشر رام نرائن لال، الہ آباد، ۱۹۳۸ء، ص ۱۰۵

(۷) مکاتیب شبلی (حصہ اول)، ص ۶۲)

(۸) ایضاً، ص ۷۰

(۹) ایضاً، ص ۷۲

(۱۰) مراد دوسری شادی ہے۔

(۱۱) قاضی تلمذ حسین صاحب ایم، اے، جو اونچا سنتے تھے۔

(۱۲) مکاتیب شبلی (حصہ دوم) مرتبہ: مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۷۱ء، ص ۲۲۴

(۱۳) مکاتیب شبلی (حصہ اول) ص ۱۴۵۔

(۱۴) ایضاً، ص ۷۔

(۱۵) ایضاً،ص ۵۲۔

(۱۶) ایضاً،ص ۱۰۳۔

(۱۷) ایضاً،ص ۲۹۔

(۱۸) ایضاً،ص ۲۷۵۔

(۱۹) مکاتیب شبلی،(حصہ دوم) ص ۸۵-۸۴۔

(۲۰) ایضاً،ص ۷۳۔

(۲۱) ایضاً،ص ۱۲۳۔

(۲۲) ایضاً،ص ۱۵۰۔

(۲۳) عبدالماجد دریابادی،شبلی نقادوں کی نظر میں،مرتبہ محمد واصل عثمانی،صفیہ اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۷ء،ص ۲۹۔

(۲۴) مکاتیب شبلی (حصہ اول)،ص ۱۲۵۔

(۲۵) ایضاً،ص ۱۳۵۔

(۲۶) مکاتیب شبلی (حصہ اول)،ص ۱۳۳،۱۳۲۔

(۲۷) ایضاً،ص ۱۳۷۔

(۲۸) ایضاً،ص ۱۸۹۔

(۲۹) ایضاً،ص ۱۴۱۔

(۳۰) ڈاکٹر محمد سید عبداللہ،نقوش لاہور،مکاتیب نمبر،مرتبہ محمد طفیل،ادارۂ فروغ اردو،لاہور، ۱۹۵۷ء،ص ۲۹۔

(۳۱) مکاتیب شبلی (حصہ اول)،ص ۱۰۔

(۳۲) ایضاً،ص ۷۵۔

(۳۳) ڈاکٹر ابن فرید،میں،ہم اور ادب،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،۱۹۷۷ء،ص ۱۳۶۔

☆☆☆

مقالات شبلی

علامہ شبلی نعمانی نے مختلف تصانیف کے علاوہ صدہا مقالے بھی اپنی یادگار میں چھوڑے تھے جو ملک کے مختلف رسالوں اور جریدوں میں بکھرے پڑے تھے، دارالمصنفین نے علامہ شبلی کی مستقل تصانیف کو شائع کرنے کے ساتھ ساتھ ان مقالوں کی تدوین واشاعت کا بھی اہتمام کیا اور ان کے مقالات کو آٹھ جلدوں میں شائع کیا، یہ جلدیں موضوعات کے لحاظ سے مرتب کی گئی ہیں، مقالات شبلی کی دوسری جلد ان مقالوں کے لئے مخصوص ہے جو ادبی ہیں اور چوتھی جلد ان مقالات کے لئے جن کو تنقیدی مقالات کا نام دیا گیا ہے، مستقل تصنیف اور مقالہ میں ایک واضح اور بڑا فرق یہ ہوتا ہے کہ تصنیف میں تو مصنف اپنے موضوع کے ہر پہلو پر جس حد تک ممکن ہوسکتا ہے تفصیلی نظر ڈالتا ہے اور اس کے ہر ہر گوشے کو اس طرح بے نقاب کرتا ہے کہ موضوع زیر بحث آئینے کی طرح روشن ہوجائے لیکن مقالہ تفصیل کا نہیں بلکہ اجمال کا حامل ہوتا ہے اور بیشتر کسی ایک موضوع کے ایک ہی پہلو پر لکھا جاتا ہے، اس میں مقالہ نگار کو اطناب کے بجائے ایجاز کا فن اپنانا ہوتا ہے، اگر مصوری کی اصطلاح استعمال کی جائے تو مقالہ کے لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تصویر چہ کی مصوری ہے اگر چہ اس تصویر کے بھی ہر خال وخط نمایاں ہوتے ہیں مگر ان کو کم سے کم جگہ میں پیش کیا جاتا ہے، تصویر کے لئے اس طرح کی جگہ کی کوئی تحدید نہیں ہوتی، علامہ شبلی کی مستقل تصانیف کا جو رنگ ہے اس کا مکمل اور بھرپور عکس ان کے مقالوں میں بھی نظر آتا ہے، اس لئے ہم درج ذیل سطور میں ان کے فن مقالہ نگاری پر ایک سرسری سی نظر ڈالتے ہیں تاکہ اس بات کا اندازہ لگایا جاسکے کہ وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بلکہ اپنی مکمل بات کس طرح کہتے ہیں؟

علامہ شبلی کی تصانیف کا اگر غائر نظروں سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جب تک ان کو موضوع زیر بحث پر پوری اور قابل اطمینان دسترس نہیں ہوتی وہ قلم نہیں اٹھاتے، علاوہ بریں ان کی تنقیدی نگاہ موضوع زیر بحث کے ہر پہلو کا ناقدانہ جائزہ لیتی چلتی ہے جس کی وجہ سے بہت سے

مسلمات ٹوٹتے ہیں اور لاتعداد غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہوتا ہے جہاں تک ان کے انداز بیان کا تعلق ہے اس کو بلاشبہ سرسید تحریک کے انداز بیان کی ایک انتہائی اعلیٰ اور رفیع الشان توضیح کا نام دیا جاسکتا ہے۔ نذیر احمد کے علاوہ سرسید تحریک سے منسلک افراد کا انداز بیان اتنا سائنسی ہوتا ہے کہ بعض اوقات اس میں چاشنی کی کمی محسوس ہونے لگتی ہے لیکن شبلی کے قلم کا اعجاز یہ ہے کہ وہ سائنسی اور عقلی انداز بیان اختیار کرنے کے باوجود زبان کی لطافت کا دامن ہاتھوں سے چھٹنے نہیں دیتے، موقع ومحل کے لحاظ سے ان کی نثر میں شاعری کی طرح مدوجزر آتے رہتے ہیں، کبھی ان کا لہجہ پرجوش ہوجاتا ہے اور آواز خطیبانہ تو کبھی وہ نرم، سجل اور نازک الفاظ میں اپنی بات کے موتی رولنے لگتے ہیں مگر تعقل اور سائنسی انداز بیان پر ان کی گرفت ڈھیلی نہیں پڑنے پاتی، شبلی کے مقالات بھی انھیں اوصاف کے حامل ہیں، انھوں نے اپنے مقالات میں نہ تو الفاظ کی جلوہ گری کے مناظر دکھائے ہیں اور نہ ہی بیجا صنائع وبدائع کا استعمال کیا ہے، اگر وہ کسی مقام پر جذباتی ہوتے بھی ہیں تو ہوش مندی کا دامن سختی سے تھامے رہتے ہیں اور اپنی نوک قلم سے کوئی ایسی بات نہیں نکلنے دیتے جو علمی دنیا میں پایۂ اعتبار سے ساقط قرار دی جاسکے، اگر ان کو اپنے کسی معاصر کے بعض افکار ونظریات سے اختلاف بھی ہوتا ہے تب بھی وہ ایک ایمان دار ناقد کی طرح اس کی اچھی اور صحیح بات کو بہ بانگ دہل اچھی اور صحیح قرار دیتے ہیں، سرسید اور شبلی کے نظریاتی اختلاف کو بعد کے لوگوں نے ایک افسانہ بنا کر پیش کیا ہے، شبلی کا درج ذیل اقتباس اس افسانے کے سارے تاروپود کو بکھیر کر رکھ دیتا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:

> ”زمانہ جانتا ہے کہ مجھ کو سرسید کے مذہبی مسائل سے سخت اختلاف تھا اور میں ان کے بہت سے عقائد وخیالات کو بالکل غلط سمجھتا تھا، تاہم اس سے مجھ کو کبھی انکار نہ ہوسکا کہ ان مسائل کو سرسید نے جس طرح اردو زبان میں ادا کیا ہے، کوئی اور شخص کبھی ادا نہیں کرسکتا۔“(۱)

اقتباس درج بالا میں ہر لفظ کا دروبست، الفاظ کا برمحل انتخاب اور کم سے کم الفاظ میں اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے کا فن نمایاں نظر آتا ہے، علاوہ بریں ان کی ناقدانہ نگاہ اس بات کی پردہ پوشی نہیں کرتی کہ ان کو بہت سے مذہبی مسائل میں سرسید سے اختلاف تھا جو ان سطور کے لکھتے وقت بھی باقی تھا، مگر اس کے باوجود وہ ایک ایمان دار ادیب اور ناقد کی حیثیت سے سرسید کے انداز بیان

اور تفہیم مسائل کی دل کھول کر داد دیتے ہیں اور اس کو اپنا ادبیانہ منصب سمجھتے ہیں، شبلی کی یہی ایمانداری، سچی بات کو سچی کہنا اور اپنی رائے کا برملا اظہار کرنا ان کے تمام مقالات کا خاصہ ہے، یہاں پر اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ ہمارے عہد کے ایک محقق اور ناقد جناب رشید حسن خاں صاحب نے شبلی کے اس وصف کو ''قطعیت'' کے نام سے موسوم کیا ہے، (۲) اور اس قطعیت کو تحقیق وتنقید دونوں کے لئے مضر قرار دیا ہے، ان کا خیال ہے کہ شبلی کے یہاں یہ ''قطعیت'' ان کی جذباتیت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے، جس کی بنا پر وہ مقالات لکھتے وقت لوگوں کی صفات کا اس انداز سے تذکرہ کرتے ہیں جو قطعیت کے زمرہ میں شامل ہو جاتا ہے، شبلی کی جذباتیت سے ہم کو بھی انکار نہیں لیکن جس قطعیت کو رشید حسن خاں صاحب شبلی کا عیب سمجھتے ہیں وہی ہمارے نزدیک ان کا ہنر ہے، اس قطعیت کی وجہ سے ان کی رائے میں کوئی جھول نہیں آنے پاتا، خواہ ہم ان کی رائے سے متفق ہوں یا نہ ہوں مگر ان کی رائے اپنی جگہ دو ٹوک اور واضح ہوتی ہے اور اس کا سمجھنا ہر شخص کے لئے آسان ہوتا ہے، مثال کے طور پر سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''سرسید کی انشاپردازی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے مختلف مضامین پر کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ لکھا ہے اور جس مضمون کو لکھا ہے اس درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ اس سے بڑھ کر ناممکن ہے، فارسی اور اردو میں بڑے بڑے شعراء اور نثار گذرے ہیں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو تمام قسم کے مضامین کا حق ادا کر سکتا۔'' (۳)

رشید حسن خاں صاحب نے شبلی کی اس بات سے اختلاف کیا ہے کہ سرسید نے جس مضمون کو لکھا ہے اس کو اس درجہ پر پہنچا دیا ہے کہ اس سے بڑھ کر ناممکن ہے۔ ان کے نزدیک شبلی کا یہ بیان قطعیت کی نشاندہی کرتا ہے، غالباً ان کو لفظ ''ناممکن'' کی وجہ سے شبلی کے بیان میں قطعیت کی جھلک نظر آئی، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ شبلی نے جو کچھ لکھا ہے وہ آج بھی اسی طرح بامعنی اور صحیح ہے جس طرح اس وقت حقیقی اور درست تھی جب یہ لکھی گئی تھی، سرسید نے اردو میں جن ٹھوس علمی موضوعات پر مقالات لکھ کر ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع کئے ان کا اگر غائر نظروں سے مطالعہ کیا جائے تو شبلی کی بات بالکل درست نظر آئے گی، سرسید کے بعد اردو زبان میں علمی لٹریچر کا خاصہ بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے اور علوم وفنون کے ہر موضوع پر دو چار کتابیں ضرور مل جائیں گی، اگر ان کا مطالعہ

کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ شبلی کی بات آج بھی درست ہے، علمی موضوعات پر ہماری زبان میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کو دو موٹے موٹے خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک قسم کی کتابیں تو وہ ہیں جن کا انداز بیان اور انشاء نہ صرف قابل فہم بلکہ قابل تحسین بھی ہے، مگر ان کا علمی پہلو کمزور ہے اور وہ اپنے موضوعات کا پورا احاطہ نہیں کر پاتیں، دوسری طرح کی کتابیں وہ ہیں جو علمی لحاظ سے تو اپنے موضوع کا بخوبی احاطہ کرتی ہیں مگر ان کا انداز نگارش کچھ ایسا ہے کہ دو صفحہ بھی ایک نشست میں پڑھنا دشوار ہے، سرسید کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے موضوع سے بھی انصاف کیا ہے اور زبان کی دلکشی کو بھی قائم رکھا ہے، شبلی نے سرسید کے اسی وصف کی تعریف کی ہے، اگر قطعیت اسی چیز کا نام ہے تو ہمارے ناقص خیال میں یہ تنقید و تحقیق کا نقص نہیں خوبی ہے۔

اب ہم شبلی کے ایک ایسے مقالہ پر نظر ڈالتے ہیں جو ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا تھا مگر اس کی معنویت آج بھی تر و تازہ ہے، یہ مقالہ ''املا اور صحت الفاظ'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے، اس کی شان نزول یہ ہے کہ محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج میگزین کے نام سے جو رسالہ شائع ہوتا تھا اس میں میگزین کے کسی صاحب علم قاری کو بعض ایسی فروگزاشتیں نظر آئیں جن کا سد باب ان کے نزدیک ضروری تھا، ان کا خیال تھا کہ اگر ان فروگذاشتوں کی اصلاح نہ کی گئی تو اردو میں بہت سے ایسے الفاظ لکھنے کا عام رواج ہو جائے گا جس سے اس کو سخت نقصان پہنچے گا، ان صاحب نے اپنی بات کو واضح کرنے کے لئے بہت سی مثالیں بھی لکھیں اور شبلی سے درخواست کی کہ وہ علی گڑھ اخبار کا ایک حصہ ایسی غلطیوں کی تصحیح کے لئے مخصوص کر دیں تو اردو زبان پر بڑا احسان ہوگا، یہ خط کافی طویل ہے جس کا ہم نے چند سطروں میں خلاصہ لکھ دیا ہے، شبلی نے اپنے مقالے کے شروع میں ان صاحب کا پورا خط نقل کر دیا ہے تا کہ ان کے تمام اعتراضات کالج میگزین پڑھنے والوں کے سامنے آجائیں، پھر انھوں نے اصل مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ: ''اردو زبان میں بہت سے ایسے الفاظ داخل ہو گئے یا ہوتے جاتے ہیں جو لغت اور ترکیب کے لحاظ سے غلط ہیں۔'' (۴)

اس اعتراف حقیقت کے بعد شبلی نے ایک بڑا اہم سوال اٹھایا ہے جو ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے:

> ''سوال یہ ہے کہ آیا یہ عام قاعدہ قرار پا سکتا ہے یا نہیں کہ جو لفظ اصل لغت کے لحاظ سے غلط ہے، اس کا استعمال بھی عموماً غلط ہے۔'' (۵)

اس خود کردہ سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے فارسی زبان کے اس تشکیلی دور کی طرف بڑے واضح اشارے کیے ہیں جب عربی زبان کے بہت سارے الفاظ فارسی زبان میں بلاتکلف داخل کیے جارہے تھے، فارسی شعراء اور نثار دونوں ہی نے بقول شبلی ''جو عربی الفاظ برتے اس قدر غلط برتے کہ آج کم مایہ اردو داں اس سے زیادہ غلطی نہیں کرسکتے۔'' ان غلطیوں کے باوجود بقول شبلی ''وہی فارسی آج مستند اور فصیح اور شیریں سمجھی جاتی ہے۔''

انھوں نے میلی، قاآنی، والہ، منوچہری، عرفی اور حزیں کے مصرعوں کو بطور مثال نقل کرکے یہ بات واضح کردی کہ ان شعراء نے جن عربی الفاظ کو فارسی میں استعمال کیا ہے وہ کس قدر غلط معنوں میں کیا ہے، لیکن اس کے باوجود بھی وہی زبان آج تک مستند سمجھی جاتی ہے، ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے شبلی رقمطراز ہیں:

> ''اصل حقیقت یہ ہے کہ زبان کی ابتدا عوام سے ہوتی ہے'' اور یہ گروہ صحت الفاظ سے بالکل بے خبر ہوتا ہے، خواص اس زبان کو لے کر کاٹ چھانٹ کر اصلاح کرتے ہیں، اصلاح میں وہ بہت سے الفاظ کو اسی طرح چھوڑ دیتے ہیں، جس کی وجہ کبھی تو یہ ہوتی ہے کہ وہ غلط الفاظ اس قدر عام استعمال میں رواج پاچکے ہوتے ہیں کہ صحت کے ساتھ بولے جائیں تو عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں، اور کبھی یہ کہ یہ امر زبان کی عزت اور خودمختاری کی دلیل سمجھی جاتی ہے کہ دوسری زبان کے الفاظ اس میں آئیں تو اسی کے قالب میں ڈھل کر آئیں۔'' (۶)

زبان کی اس خودمختاری کو واضح کرنے کے بعد انھوں نے ہر قسم کے الفاظ کے استعمال وعدم استعمال کے لئے جو قاعدہ کلیہ قرار دیا ہے وہ انھیں کے الفاظ میں یہ ہے:

> '' جو الفاظ فصحا اور مسلم الثبوت اہل زبان کے عام استعمال میں آجائیں وہ صحیح الاستعمال ہیں اور جن کو اہل زبان نے عمومانہ قبول کرلیا ہو، ان کا استعمال صحیح نہیں۔'' (۷)

یہ مقالہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں شبلی نے زبان کو کوئی جامد وساکت شے نہیں بلکہ ایک زندہ اور متحرک چیز قرار دیا ہے جس میں نئے نئے الفاظ بھی داخل ہوتے رہیں گے پرانے الفاظ کے معانی اور مفاہیم میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہیں گی اور جو الفاظ اپنی معنویت برقرار نہ رکھ سکیں

گے وہ متروک ہوتے رہیں گے، صحت زبان کا مسئلہ شبلی کے زمانہ میں بھی تھا اور ہمارے زمانے میں بھی موجود ہے، اگر ہم شبلی کے درج بالا خیالات کو مشعل راہ بنالیں تو اردو زبان سے متعلق بہت سی ناگوار بحثوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

انگریزوں کی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی نے ہندوستانیوں میں جو مسائل پیدا کئے ان میں سب سے اہم اور خطرناک مسئلہ زبان کا تھا، ۱۹۱۲ء میں یوپی کے چیف سکریٹری مسٹر برن نے ایک ورنا کیولر (VERNACULAR) کمیٹی اس مقصد کے لئے بنائی کہ اسکولوں اور کالجوں میں دیسی زبان کا کورس اس طرح مرتب کیا جائے جو اردو اور ہندی دونوں کے الفاظ اور عبارت میں پڑھی جا سکے، مولانا شبلی بھی اس کمیٹی کے ممبر تھے، ان کو اس تجویز سے سخت اختلاف تھا، انھوں نے اپنے اختلاف کو ایک نوٹ کی شکل میں لکھ کر کمیٹی کے سامنے پیش کیا، یہ نوٹ اتنا جامع اور حقیقت پر مبنی تھا کہ کمیٹی کے ہندی داں ممبروں نے شبلی کی حمایت کی اور انگریزوں کی یہ چال ناکام ہو کر رہ گئی، شبلی کا یہ نوٹ مولانا سید سلیمان ندوی نے اکتوبر ۱۹۱۶ء کے معارف میں ''اردو ہندی'' کے عنوان سے شائع بھی کر دیا تھا، نوٹ خاصا طویل ہے اس لئے ہم ان سطور میں شبلی کے خیالات کا خلاصہ ہی پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

مسٹر برن نے اپنی یادداشت میں اردو اور ہندی کو دراصل ایک ہی زبان قرار دیا تھا، کیوں کہ ان دونوں کی گرامر ایک ہے ان کے نزدیک جن دو زبانوں کی گرامر ایک ہوتی ہے وہ دراصل ایک ہی زبان ہوتی ہیں، شبلی مرحوم نے مسٹر برن کے اس خیال سے اختلاف کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

> ''اگر دو زبانوں کی گرامر ایک ہو لیکن الفاظ بالکل مختلف ہوں تو ان کو ایک زبان نہیں کہہ سکتے، مشرقی ہندوستان کی زبانوں کی گرامر قریباً بالکل متحد ہے باوجود اس کے نہ وہ ایک زبانیں کہی جا سکتی ہیں، نہ ان کا کوئی مشترک کورس بن سکتا ہے۔'' (۸)

اس تحریر کی خوبی یہ ہے کہ شبلی نے اپنے زمانے کی ہندی کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، ان کے نزدیک ایک قسم تو وہ ہے جو دیہاتوں میں بولی جاتی ہے اور اس کو گنوار بولتے ہیں، دوسری جو شہر میں تعلیم یافتہ ہندو روزمرہ استعمال کرتے ہیں، شبلی کے نزدیک پہلی قسم کی ہندی میں یہ صلاحیت نہیں

ہے کہ اس میں کوئی کورس مرتب کیا جا سکے، اس کے لئے انھوں نے تین دلائل دیے ہیں اور یہ دکھلایا ہے کہ ہر ضلع کی یہ ہندی الگ ہے اور ایک ضلع کا آدمی دوسرے ضلع کے آدمی کی بات کو آسانی سے نہیں سمجھ سکتا، علاوہ بریں اس زبان میں روزمرہ کے مطالب تو بیان ہو سکتے ہیں مگر یہ علمی زبان نہیں بن سکتی، دوسری قسم کی ہندی کے بارے میں شبلی نے تسلیم کیا ہے کہ اس میں اور اردو میں کوئی خاص فرق نہیں ہے، مگر ان کے نزدیک کوئی مشترک کورس بنانے میں جو دقتیں درپیش ہوں گی ان میں سے اہم ترین یہ ہیں:

> ''اس قسم کی مشترک زبان صرف اس حد تک لٹریچر کے لئے کافی ہو سکتی ہے جو نہایت معمولی مطالب اور خیالات کے ادا کرنے کے لئے کافی ہو، جیسے کہ جنرل ریڈر کی زبان ہے لیکن جب کہ یہ مقصود ہے کہ ورنیکلر کا سلسلہ کالج کے اخیر کلاسوں تک قائم رہے تو ایسے نصاب کے بنانے کی ضرورت ہوگی، جس میں ہر طرح کے علمی مضامین اور علمی خیالات ادا کئے جائیں، اس حالت میں ان مضامین اور خیالات اور اصطلاحات کے ادا کرنے کے لئے عام روزمرہ کے الفاظ کافی نہ ہوں گے، بلکہ کسی علمی زبان سے مستعار لینے پڑیں گے، یہ علمی زبان عربی یا سنسکرت ہوگی اور یہاں سخت کشمکش پیدا ہوگی، مسلمان ہرگز اس بات پر رضامند نہ ہوں گے کہ بجائے ان عربی الفاظ کے جن کو ہر تعلیم یافتہ مسلمان نہایت آسانی سے فوراً سمجھ سکتا ہے، سنسکرت کے الفاظ سیکھیں جو ان کے لئے بالکل گوش ناآشنا ہیں، ہندو بھی اگرچہ ان الفاظ سے درحقیقت گوش آشنا نہیں ہوں گے لیکن وہ بطور ایثار کے اس محنت کو برداشت کریں گے۔ بہرحال جنرل ریڈر مروجۂ حال سے آگے چل کر صاف فیصلہ کر دینا ہوگا کہ ہندی اور اردو کے کورس الگ الگ ہو جائیں۔'' (۹)

اس سلسلے میں شبلی نے جو نقصانات بتائے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ نصاب تعلیم مرتب کرتے وقت ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہمیشہ کشمکش رہے گی کہ علمی اصطلاحات عربی سے اخذ کئے جائیں کہ سنسکرت سے، علاوہ بریں اس طرح کی جو زبان عالم وجود میں آئے گی وہ نہ تو اردو ہوگی اور نہ ہی ہندی بلکہ ایک نئی زبان ہوگی، اس لئے دونوں زبانوں کو الگ الگ اس طرح ترقی دینی چاہئے کہ وہ ایک دوسرے کی راہ میں حائل نہ ہوں، اس تحریر کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے:

''گرامروں کے معمولی اشتراک سے دونوں زبانوں کو ایک قرار دینا اور اس کی بناء پر آخیر درجہ تک دونوں کا ایک نصاب بنانا سخت غلطی ہے، جس سے دونوں زبانیں برباد ہو جائیں گی۔(۱۰)

شبلی نے اس تحریر میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی معنویت آج بھی برقرار ہے، آج بھی ہندی اور اردو کی جو کشمکش اور کشاکش ہے اس کو شبلی کے فرمودات کی روشنی میں بہت کچھ کم کیا جا سکتا ہے اور دونوں زبانوں کو الگ الگ اور آزادانہ حیثیت سے پروان چڑھانے میں ان کے خیالات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

اسی جلد کا ایک اور مقالہ ہماری خاص توجہ کا مستحق ہے جس کا عنوان ''عربی اور فارسی شاعری کا موازنہ'' ہے، شبلی عربی اور فارسی دونوں زبانوں کے معتبر عالم تھے جیسا کہ معلوم ہے عربی سامی النسل زبان ہے اور فارسی آریائی النسل، مگر تاریخ کی یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ایک آریائی النسل زبان فارسی، سامی النسل زبان عربی سے اس طرح متاثر ہوئی کہ اس نے وقت کے تقاضے کو سامنے رکھتے ہوئے اپنا آریائی رسم الخط تک بدل ڈالا اور اس کی جگہ پر عربی رسم الخط اختیار کیا جو آج بھی فارسی زبان کا مسلمہ رسم الخط ہے، علاوہ بریں فارسی میں تنوین کا استعمال عربی ہی کے اثر سے شروع ہوا ہے، جمع بنانے کا قاعدہ بھی عربی سے اخذ کیا گیا، اگرچہ قدیم فارسی طریقہ بھی برقرار رہا، اسی کے ساتھ ساتھ ہزارہا عربی الفاظ فارسی زبان میں اس طرح داخل ہو گئے کہ اگر آج ان الفاظ کو فارسی زبان سے خارج کر دیا جائے تو فارسی زبان بالکل بے مایہ ہو کر رہ جائے گی۔

ظہور اسلام سے بہت پہلے فارسی میں شعر گوئی کی روایت موجود تھی صرف یہی نہیں بلکہ بعض بعض ناقدین ادب نے تو پارسی مذہب کی مقدس کتاب ''اوستا'' کو بھی منظوم کلام قرار دیا ہے، عربی اور فارسی شاعری میں صرف یہ فرق تھا کہ عربی شاعری عروضی اوزان کی پابند تھی اور ظہور اسلام سے قبل کی فارسی شاعری ہجائی اوزان کی، جب عربوں نے ایران کو فتح کر لیا اور ایرانیوں نے پہلوی رسم الخط کے نقائص کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کو ترک کر کے عربی رسم الخط اختیار کیا تو ایرانی علماء اور فضلاء کو عربی شاعری سے روشناس ہونے کا نادر موقع ملا، غالباً اس کے اثر سے ایرانیوں نے بھی عروضی اوزان کی پابندی کی اور ظہور اسلام کے بعد کی تمام کی تمام فارسی شاعری ہجائی اوزان سے

یکسر عاری نظر آتی ہے، اس تہذیبی لین دین کی وجہ سے عربی اور فارسی دونوں زبانوں کی شاعری کو بڑا فائدہ ہوا، علامہ شبلی نے اپنے درج بالا مقالہ میں اس بات کا جائزہ لیا ہے کہ عربی شاعری کے وہ کون کون سے خصائص ہیں جو فارسی شاعری میں نہیں ہیں اور فارسی شاعری کے وہ کون کون سے خصائص ہیں جن سے عربی زبان کی شاعری محروم ہے، اس سلسلے میں شبلی نے عربوں کی رزمیہ شاعری، آزادانہ خیالات، مفاخرت، مناظر قدرت کا بیان، جذبات انسانی کی عکاسی کو عربی شاعری کے بنیادی خصائص قرار دیا ہے، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ شبلی فردوسی اور نظامی کی رزمیہ شاعری سے ناواقف تھے یا فارسی شعراء نے جس طرح جذبات انسانی کی عکاسی کی ہے ان سے ناآشنا تھے، اصل معاملہ یہ ہے کہ شبلی کے نزدیک گفتار و کردار میں یک رنگی اور یکسانیت ہونی چاہئے، ان کے نزدیک فارسی شعراء گفتار کے تو غازی ہیں مگر کردار کے میدان میں وہ عربوں سے بہت پیچھے رہتے ہیں، اسی لئے انھوں نے ان تمام موضوعات کے سلسلے میں عربی شاعری کو فارسی شاعری پر فوقیت دی ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ان کے نزدیک فارسی شاعری کی چند ترجیحی خصوصیات بھی ہیں، جن میں عربی شاعری اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، وہ ترجیحی خصوصیات یہ ہیں، عربی شاعری صنف مثنوی سے عاری ہے، اس میں فلسفیانہ، اخلاقی اور متصوفانہ خیالات کو ادا کرنے کی وہ صلاحیت نہیں ہے جو فارسی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے، اس کے علاوہ فارسی شاعری میں صنف غزل کے جو لطیف، پر کیف اور دلکش نمونے وافر تعداد میں ملتے ہیں، عربی شاعری ان سے بھی یکسر عاری ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ عربی شاعری میں وہ خیالات کا تنوع نہیں ملتا جو فارسی شاعری میں ہر دور میں جلوہ گر رہا ہے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ فارسی شاعری نے تشبیہات میں جو ندرت اور جدت پیدا کی وہ عربی شاعری میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔

درج بالا سطور میں عربی اور فارسی شاعری کے خصائص کے بارے میں شبلی کے افکار وخیالات کا جو سرسری جائزہ لیا گیا ہے اس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ شبلی خواہ کسی موضوع پر مقالہ لکھیں اس کے ہر پہلو کا نہ صرف احاطہ کر لیتے ہیں بلکہ ہر ہر پہلو کے حسن و قبح کو نمایاں بھی کرتے جاتے ہیں اور درست کو درست اور غلط کو غلط کہنے میں دریغ بھی نہیں کرتے۔

چوتھی جلد کے وہ مقالات جن کو مقالات شبلی کے مرتب نے تنقیدی کا نام دیا ہے، ہمارے

نزدیک اصلاً وہ تعارفی مقالات ہیں جن کو شبلی نے یورپ سے شائع ہونے والی عربی اور فارسی کتابوں کا شرح وبسط سے تعارف کرانے کے لئے لکھا ہے، ان مقالات میں شبلی نے نہ تو اصل کتاب پر کوئی تنقید کی ہے اور نہ ہی مرتبین کے انداز ترتیب یا ان کے افکار وآراء پر۔ ان مقالات میں شبلی نے سب سے پہلے تو اصل کتاب کے موضوع سے قارئین کو روشناس کرایا ہے، بعد ازاں اس کے مندرجات پر نظر ڈالتے ہوئے اپنے قاری کو کتاب کے تمام مباحث کی سیر کرائی ہے، ان مقالات میں بھی شبلی کا انداز تحریر وہی ہے جو ان کے ادبی مقالات میں ملتا ہے اس جلد میں شبلی کے جس مقالے کو ''تنقیدی'' کہا جا سکتا ہے وہ تمدن اسلام مصنفہ جرجی زیدان کی پردہ دری ہے، اس مقالے کے لئے ہم نے تنقیدی کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے کہ اس مقالہ میں جرجی زیدان کے افکار وخیالات اور اخذ نتائج پر بڑے مدلل انداز سے تنقید کی گئی ہے، حالاں کہ اس تنقید کا تعلق ادبیات کے کسی پہلو سے نہیں ہے اور نہ ہی اس قسم کے مقالے کو اصطلاحی معنوں میں تنقیدی مقالہ کہا جا سکتا ہے، شاید اسی مقالے کی شمولیت کی وجہ سے اس کتاب کے مرتب نے ان کو تنقیدی مقالات کہا ہے۔

ان مقالوں میں جن جن عربی وفارسی کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے ان سے عام اردو خواں بالکل ناواقف تھے، اس لئے شبلی نے اس بات کی سعی کی ہے کہ اپنے مخصوص لب ولہجے اور انداز بیان میں زیر تعارف کتاب کے تمام مباحث کو سمولیں، چاہے وہ مناقب عمر بن عبدالعزیز والا مقالہ ہو، چاہے تجارب الامم ابن مسکویہ والا، مآثر رحیمی والا مقالہ ہو، چاہے تزک جہاں گیری والا، ہمایوں نامہ والا ہو، چاہے معرکۂ مذہب وسائنس والا، شبلی کی یہ روش ہر مقالے میں برقرار رہتی ہے، تزک جہاں گیری کا تعارف کراتے ہوئے شبلی کا قلم رقص کرنے لگتا ہے، وہ اپنے تعارف کی ابتدا اس فارسی شعر سے کرتے ہیں ؎

من چنداں گنہ از بدگمانی می کند نیست
کہ من ہم در گماں افتادہ پندارم گنہ گارم

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ بدگمانی کی وجہ سے مجھ کو اتنے گناہوں سے (اس تواتر کے ساتھ) نسبت دی جاتی ہے کہ میں بھی اس گمان میں پڑ کر یہ سمجھنے لگا ہوں کہ میں واقعی گنہ گار ہوں، اس شعر کو

لکھ کر شبلی نے اپنے قارئین کو یہ بات یاد دلائی ہے کہ جہاں گیر کی شخصیت کے گرد بدگمانی کا کس قدر گردوغبار چھایا ہوا تھا، اس کو صرف ایک شرابی اور عیش پرست بادشاہ سمجھا جاتا ہے اور اس کی جہاں داری اور جہاں گیری کی جو واقعی اور حقیقی خوبیاں ہیں ان کو یکسر فراموش کر دیا گیا ہے، اس کے بعد وہ تزک جہاں گیری پر نظر ڈالتے ہوئے جہاں گیر کے ایک ایک وصف کو نمایاں کرتے ہیں، شبلی کے نزدیک اس کا سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ اگر وہ کوئی عیب بھی کرتا ہے تو ڈنکے کی چوٹ پر اس کا اعلان بھی کرتا ہے، اس سلسلے میں انھوں نے تزک جہاں گیری سے دو عبارتیں بھی نقل کی ہیں، پہلی عبارت میں وہ صاف صاف اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ ابوالفضل کو قتل کروانے میں اس کا ہاتھ تھا کیوں کہ جہاں گیر کے نزدیک ابوالفضل ''مفسد فتنہ انگیز'' تھا، دوسری عبارت میں وہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ شاہ جہاں نے چوبیس سالہ اور دو بچوں کا باپ ہونے کے باوجود اپنے ہونٹ شراب سے تر نہ کئے تھے، اس نے ترغیب دے کر ایک جشن کے موقع پر شاہ جہاں کو شراب پلوائی اور تزک جہاں گیری میں بلا تکلف اس کو لکھ بھی دیا۔

شبلی نے اپنے اس طویل مقالے میں جہاں گیر کی قدرت زبان پر بھی خاصی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اپنے خیال کی تائید میں تزک جہاں گیری سے کئی عبارتیں بھی نقل کی ہیں، موسم کا بیان ہو یا نادر جانوروں کا، جشن کی چہل پہل ہو یا شکار کی دوڑ دھوپ، لڑائی کا ہنگامہ ہو یا دوستوں کی بلا تکلف صحبت، ہر حالت اور ہر کیفیت کو وہ اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ بڑے بڑے انشاء پرداز بھی اس سے بہتر الفاظ کا انتخاب نہ کر سکیں، موقع اور محل کے لحاظ سے اس کے لہجے کا اتار چڑھاؤ بھی بدلتا رہتا ہے اور وہ نئے نئے انداز سے واقعات کی تصویر کشی کرتا رہتا ہے۔

شبلی نے تزک جہاں گیری کی اس خصوصیت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اس کے صفحات میں ایسے بہت سے واقعات ہیں جن کا تعلق جہاں گیر کی ملکی مہمات سے ہے، ان صفحات کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں یہ خیال درست نہیں ہے کہ وہ ہر وقت شراب کے نشے میں مست رہتا تھا اور اس کے پردہ میں نور جہاں حکمرانی کرتی تھی، اس سلسلے میں زنجیر عدل کا لٹکایا جانا اور تخت نشینی کے فوراً بعد بارہ (دوازدہ) احکامات کے صادر کرنے کے متعلق اس نے جو کچھ تحریر کیا ہے شبلی نے بڑے مناسب انداز سے سب کا خلاصہ اپنے پڑھنے والوں کے سامنے پیش کر دیا ہے،

ان احکامات میں بہت سے ٹیکسوں کی موقوفی، موتی کے مال کو ورثاء کے سپرد کرنا، ممالک محروسہ میں خراب اور دوسری نشہ آور چیزوں کا فروخت نہ ہونا، ناک کان وغیرہ کاٹنے کی سزا کو ختم کر دینا قیدیوں کو آزاد کرنے کا حکم صادر کرنا شامل ہے۔

جہاں گیر کو جغرافیہ اور تحقیق سے خاصہ شغف تھا، شبلی نے تزک جہاں گیری سے بہت سی عبارتیں نقل کر کے جہاں گیر کے اس ذوق کی نشاندہی کی ہے، کبھی وہ شکار کیے ہوئے جانوروں کو چیر پھاڑ کر ان کے اندرونی اعضاء کا مطالعہ کرتا تو کبھی کشمیر کے جغرافیہ کا محققانہ مطالعہ کر کے اپنے اخذ کردہ نتائج کو تزک میں تحریر کرتا، شبلی نے اس موقع پر جہاں گیر کے جانور خانہ کا بھی خاص طور سے ذکر کیا ہے، جس میں اس نے طرح طرح کے عجائب جمع کر رکھے تھے، اسی طرح اس کے ذوق مصوری پر بھی مفصل بحث کی گئی ہے اور تزک جہاں گیری کی عبارتوں سے اس فن میں اس کی مہارت کو نمایاں کیا گیا ہے، اس مقالہ کا سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے جس کو شبلی نے تحقیقات اشیا کے ذیلی عنوان سے لکھا ہے، اس سلسلے کے دلچسپ واقعات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جہاں گیر نے سن رکھا تھا کہ زعفران ''خندہ زا'' ہوتا ہے اس نے اس خیال کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے ایک قیدی کو پاؤ سیر زعفران کھلوائی جس کا کچھ اثر نہ ہوا، دوسرے دن یہ مقدار آدھ سیر کر دی گئی مگر پھر بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا، جس سے اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ زعفران کی یہ صفت غلط مشہور ہو گئی ہے، اسی طرح دوسری دوسری تحقیقات کو بھی شبلی نے اپنے مقالے میں اجاگر کیا ہے۔

مورخ شبلی نے تزک جہاں گیری پر لکھتے ہوئے جہاں گیر کی دادرسی، عدل پروری، رعایا کی خبر گیری، اس کی عام پالیسی، ہندوؤں سے تعلقات، علماء اور فقراء کی قدر دانی پر بھی بڑے مفصل انداز سے نظر ڈالی ہے، غرض کہ شبلی نے تزک جہاں گیری کا اس انداز سے اور اتنا بھرپور اور مدلل تعارف کرایا ہے کہ اس کے مطالعے کے بعد شاید کوئی کم فہم ہی یہ کہنے کی ہمت کر سکے کہ جہاں گیر ہر وقت شراب کے نشے میں مست رہتا تھا اور کاروبار سلطنت نور جہاں کی نگرانی میں انجام پاتا تھا۔

اسی طرح کا دوسرا مقالہ ''مآثر رحیمی اور عبدالرحیم خان خاناں'' بھی ہے، شبلی نے دسمبر ۱۹۰۶ء میں کلکتہ کا سفر کیا تھا، وہاں ان کو ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ کو دیکھنے کا موقع ملا اور مآثر رحیمی کا ایک قلمی نسخہ ان کی نظر سے گزرا، یہ مقالہ اسی کا ایک مفصل اور بھرپور تعارف کراتا ہے، اصل

مخطوطہ دو ہزار صفحات پر محیط ہے، جن میں نصف کے قریب صفحات خان خاناں کے اسلاف اور تیموری بادشاہوں کے حالات کے لئے وقف ہیں، بقیہ صفحات میں خان خاناں کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں، اس کتاب کا مصنف عبدالباقی ہے جو ایرانی النسل ہے اور اس نے یہ کتاب خان خاناں کی زندگی ہی میں لکھی تھی۔

جن صفحات میں خان خاناں کے حالات بیان کئے گئے ہیں، ان میں اس کے دربار کے صناعوں، کاریگروں، شعراء، علماء، اطباء اور خوش نویسوں کے بارے میں بھی مستند اور مفصل معلومات درج ہیں، اس طرح مآثر رحیمی صرف خان خاناں کا تذکرہ ہی نہیں رہ جاتا بلکہ اس عہد کے علم وادب کی ایک مستند تاریخ بھی بن جاتا ہے۔ شبلی نے خان خاناں کی شاعری اور انشاپردازی کا بطور خاص ذکر کیا ہے اور مثال کے طور پر اس کی ایک فارسی غزل بھی نقل کی ہے جو ایک طرحی مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی، اس بحر اور ردیف وقافیہ میں اکبری دور کے بیشتر شعراء نے غزلیں کہی تھیں مگر بقول شبلی میدان خان خاناں ہی کے ہاتھ رہا۔ شبلی نے اپنے مقالے میں جن صناعوں، شعراء، علماء، اطباء اور خوش نویسوں کے چند سطروں میں حالات لکھے ہیں ان میں شیخ عبدالسلام، شجاع، ملا عبدالرحیم عنبریں قلم، ملا محمد امین، ملا محمد حسین، میر باقی ماوراء النہری، میاں ندیم، بہبود، مولانا مشفق اور مادھو وغیرہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ شبلی نے خان خاناں کی "تربیت شعراء" کو بھی خاص طور سے اجاگر کیا ہے اور تفصیل سے بتلایا ہے کہ وہ کس طرح شعراء کی تربیت کرتا، ان کو اکرام وانعام سے نوازتا اور ان کو فکر معاش سے بھی بے نیاز کر دیتا، عرفی، شکیبی، حیاتی، ظہوری، ملک قمی، نظیری، محتشم کاشی، رسمی اور نوعی شیرازی کسی نہ کسی طرح سے خان خاناں کے دربار سے منسلک رہتے تھے، اسی لئے مآثر رحیمی کے مصنف عبدالباقی نے ان لوگوں کے بارے میں بھی تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں، ان معلومات کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ یہ ایک ایسے معاصر کے قلم کی فراہم کردہ ہیں جو ان شعراء سے ذاتی طور پر واقف تھا، غالباً یہی وجہ ہے کہ اس نے ان کے متعلق بہت سی ایسی باتیں لکھی ہیں جو کسی اور کتاب میں نہیں ملتیں۔

مآثر رحیمی کے مصنف نے خان خاناں کے رفاہ عام اور صنعت وزراعت کی ترقی کے کاموں، عمارات، حمام، جہازات، ابری اور عکسی کاغذ سازی کو بھی بڑے واضح الفاظ میں بیان کیا

ہے، شبلی نے اپنے مقالے میں ان تمام چیزوں کی طرف اجمالی اشارے کر دیے ہیں تاکہ ان کے قاری کو اس بات کا علم ہو سکے کہ خان خاناں صرف سپہ سالار اور شاعر ہی نہ تھا بلکہ کچھ اور بھی تھا، اس کتاب کا بھرپور تعارف کرانے کے بعد شبلی نے اس میں جو خامی محسوس کی اس کو بھی واشگاف الفاظ میں تحریر کر دیا ہے، ان کے نزدیک اس کتاب کی خامی یہ ہے:

> ''اس کتاب (مآثر رحیمی) میں تمام خوبیوں کے ساتھ یہ بہت بڑا عیب ہے کہ خان خاناں کی خوبیاں ہی خوبیاں گنائی ہیں، نکتہ چینی کا نام نہیں، حالانکہ آج کل کے مذاق کے موافق سوانح عمری اور لائف کی یہ ضروری شرط ہے۔''(۱۱)

اسی طرح کی ایک اور مثال'' ہمایوں نامہ'' بھی ہے، یہ کتاب ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم کی تصنیف کردہ ہے، جو بیسویں صدی کی ابتدا تک زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکی تھی، ایک یورپین لیڈی انیٹ ایس بیورج نے اس کتاب کے متعدد نسخے بہم پہنچا کر اس کا ایک تنقیدی متن مرتب کیا اور گلبدن بیگم کی مفصل سوانح عمری، ترکی الفاظ کی تحقیق اور متن کے انگریزی ترجمے کے ساتھ اس کو شائع کر کے علمی دنیا کو ایک نایاب تحفے سے نوازا، شبلی نے اپنے مقالے کے ابتدائی صفحات میں ان خاتون کی کوششوں کا بڑے واضح الفاظ میں ذکر کیا ہے، اس کے بعد انھوں نے کتاب کا ایک بھرپور اور مفصل تعارف کرایا ہے، جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

سب سے پہلے انھوں نے گلبدن بیگم کی انشاء پردازی کی خصوصیات کی نشاندہی کی ہے اور مثالوں سے واضح کیا ہے کہ گلبدن بیگم کی نثر کتنی سلیس، سادہ اور رواں ہے، اس کے چھوٹے چھوٹے جملے، سادہ اور بے تکلف الفاظ بے اختیار پڑھنے والوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں، اسی سلسلۂ سخن میں انھوں نے بہت سے ان محاوروں کی بھی نشاندہی کی ہے جو ہمایوں نامہ کے اوراق پر دکھائی دیتے ہیں۔

شبلی نے گلبدن بیگم کے تاریخی مذاق پر خاص طور سے روشنی ڈالی ہے، ان کے نزدیک اس کتاب کی اہمیت اس لئے اور بڑھ جاتی ہے کہ اس میں اپنے دور کے معاشرے کی بڑی اچھی عکاسی کی گئی ہے، اس کتاب سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عورتوں کو فن سپہ گری کی بھی تعلیم دی جاتی تھی، علاوہ بریں عورتیں فن موسیقی میں بھی مہارت رکھتی تھیں اور اپنے خاندان کے افراد کے سامنے اس فن کا مظاہرہ بھی کرتی تھیں، اس زمانے کی خواتین اپنی شادی اور نکاح کے معاملے میں

پوری طرح آزاد تھیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ نامحرموں سے پردہ کرتیں اور بے محابہ آزادی کا مظاہرہ نہ کرتیں۔

گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ میں جو ملکی اور سیاسی واقعات لکھے ہیں شبلی نے ان کو نظر انداز کردیا ہے اور اس کے صرف اس حصے کو نمایاں کیا ہے جو اس دور کے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے، بابر فرغانہ سے ہندوستان آیا تھا اور اس کی مادری زبان ترکی تھی، اس کے زیر اثر تیموری خاندان میں ترکی زبان کا عمل دخل بہت دنوں تک رہا، اسی لئے گلبدن بیگم کی اس فارسی تصنیف میں بھی بہت سے ترکی الفاظ اور اصطلاحات ملتی ہیں، جن کے بارے میں شبلی نے لکھا ہے کہ وہ ان کو نہیں سمجھ سکتے، ورنہ سوشل لائف کی پوری تصویر اس سے تیار ہو سکتی تھی، انھوں نے اپنی تحریر ان الفاظ پر ختم کی ہے:

> ''اخیر میں ہم کو دوبارہ اس معزز انگریزی خاتون کے علمی شوق کی داد دینی چاہئے،
> جس نے اس نایاب کتاب کے بہم پہنچانے اور تصحیح و تحشیہ میں وہ قابلیت اور محنت صرف کی،
> جو ہماری قوم کے مردوں سے بھی بن نہیں آتی۔'' (۱۲)

مقالات شبلی کے موضوعات تو اپنی جگہ اہم ہیں ہی، مگر ان کی قدر و قیمت شبلی کے انداز بیان میں پنہاں ہے، جس نے ان کی تعارفی تحریر کو تخلیقی حسن سے مزین کردیا ہے، شبلی کی پوری نثر نگاری اسی تخلیقی صلاحیت اور شعور کی غماز ہے اور یہی چیز ان کو ان کے معاصرین میں منفرد و یگانہ بناتی ہے، شبلی کا کوئی مقالہ لے لیجئے خواہ وہ مذہبی موضوعات سے متعلق ہو، خواہ تاریخی یا ادبی موضوعات سے، ہر جگہ ان کا یہی انداز بیان نظر آئے گا، ہم چونکہ صرف دارالمصنفین کی ادبی خدمات کا تعارف پیش کررہے ہیں اس لئے ان کے دوسرے دوسرے مقالات سے صرف نظر کرنے پر مجبور ہیں، ورنہ ان مقالوں میں بھی انداز بیان، استدلال اور خیالات کی برجستگی کو نمایاں کرتے۔

☆☆☆

حواشی:

(۱) مقالات شبلی، جلد دوم، مرتبہ: مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۵۰ء مضمون سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر، ص ۶۴۔

(۲) رشید حسن خان، انتخابات مضامین شبلی، مکتبہ جامعۂ دہلی، ۱۹۷۱ء، ص ۱۵۔

(۳) مقالات شبلی جلد دوم، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، ص ۶۱۔

(۴) مقالات شبلی جلد دوم، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، ص ۶۹۔

(۵) مقالات شبلی، جلد دوم، مرتبہ سید سلیمان ندوی، ص ۶۹۔

(۶) ایضاً، ص ۷۰۔

(۷) مقالات شبلی، جلد دوم مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، ص ۷۱۔

(۸) مقالات شبلی، جلد دوم، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، ص ۷۶، ۷۷۔

(۹) مقالات شبلی جلد دوم، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، ص ۷۵۔

(۱۰) ایضاً، ص ۷۸۔

(۱۱) مقالات شبلی، جلد چہارم، مرتبہ: مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۳۴ء ص ۸۱۔

(۱۲) ایضاً، ص ۶۵۔

☆☆☆

کلیاتِ شبلی

(اردو)

مولانا سید سلیمان ندوی نے شبلی کے بچپن کے ایک استاد کے حوالے سے لکھا ہے کہ شبلی کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا اور وہ کم عمری ہی سے شعر کہنے لگے تھے،(۱) ابتدا میں اپنے استاد فاروق چریا کوٹی کی شاعری سے متاثر ہوئے جو فارسی اور اردو کے اچھے شاعروں میں شمار ہوتے تھے، علاوہ بریں جب وہ کچھ دنوں تک غازی پور کے مدرسہ چشمۂ رحمت میں ایک طالب علم کی حیثیت سے قیام پذیر تھے تو ان کو اس زمانے کے ایک ممتاز شاعر عبدالاحد شمشاد سے بھی استفادہ کا موقع ملا۔(۲) ان دنوں شعر و شاعری کا چرچا عام تھا، خود ان کے وطن اعظم گڑھ میں آئے دن مشاعرے ہوا کرتے، جن میں شبلی بھی شریک ہو کر ایک مبتدی کی حیثیت سے اپنا کلام پڑھتے اور داد وتحسین وصول کرتے۔ اس زمانے میں ان کا تخلص تسنیم تھا،(۳) جس کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انھوں نے یہ تخلص اس وقت کے مشہور لکھنوی شاعر منشی امیر اللہ کے تخلص تسلیم کے تتبع میں اختیار کیا تھا۔ لیکن بعد میں اس کو ترک کر کے انھوں نے اپنا تخلص اپنے نام ہی کو قرار دیا۔ افسوس ہے کہ چند اشعار کے سوا ان کے ابتدائی دور کا کلام محفوظ نہ رہ سکا ان کا جو بھی شعری سرمایہ ہمارے سامنے موجود ہے وہ قیام علی گڑھ یا اس کے بعد کے زمانے کا ہے۔ انھوں نے شاعری کی تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی جس کے کچھ نہ کچھ نمونے خوش قسمتی سے ''کلیات شبلی'' کی شکل میں محفوظ ہیں۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ شاعری میں علامہ شبلی کا وہ مقام نہیں ہے جو ان کو نثر نگاری کے میدان میں حاصل ہے۔ تاہم ان کے بعض شعری خصائص ایسے ضرور ہیں جو ان کی شاعری کو آج بھی زندہ کئے ہوئے ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے شبلی کی شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ تاریخی اعتبار سے ان کی شاعری کے ادوار کی یہ تقسیم درست ہے اور اس تقسیم کے ذریعے سے ہم کو شبلی

کی شاعری کے ارتقاء کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ہمارے خیال میں اس تقسیمِ ادوار سے صرف نظر کرتے ہوئے اگر ہم کلام شبلی کا صنف وار مطالعہ کریں تو غالباً شاعر شبلی تک ہماری واقعی اور حقیقی رسائی ہو سکے گی۔ اس لئے ہم درج ذیل سطور میں شبلی کی شاعری کا صنف وار جائزہ لے کر ان کے اشعار کی اہمیت و معنویت کو اجاگر کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ان کی مثنوی نگاری پر ایک سرسری سی نظر ڈالتے ہیں۔ حالی اور شبلی سے پہلے اردو زبان میں جو مثنویاں لکھی گئیں ان میں بیشتر بلکہ تمام تر یا تو منظوم عشقیہ داستانیں ہوتیں یا شکایتِ روزگار وغیرہ سے متعلق شاعر کے ذاتی تاثرات۔ کبھی کبھی مناظرِ فطرت یا موسموں پر بھی چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھی جاتیں۔ لیکن حالی و شبلی سے پہلے صنف مثنوی عشقیہ داستانوں کو نظم کرنے ہی سے عبارت تھی۔ میر، سودا، میر اثر، میر حسن، نسیم وغیرہ نے جو مثنویاں لکھی ہیں ان میں سے زیادہ تر عشقیہ ہیں، یہ عشقیہ مثنویاں المیہ بھی ہیں اور طربیہ بھی، مگر ہیں سب کی سب عشقیہ ہی۔ حالی اور آزاد اردو کے پہلے شعراء ہیں جنھوں نے صنف مثنوی کو عشق کے تنگ میدان سے نکال کر زندگی کے وسیع میدان میں لا کھڑا کیا۔ علامہ شبلی نے بھی حالی اور آزاد کی اسی روایت کی توسیع کرتے ہوئے قومی اور وطنی موضوعات پر مثنوی کی صنف میں اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کیا، یوں تو شبلی کی صرف ایک مثنوی ''صبح امید'' ہم تک پہنچ پائی ہے، مگر صرف اسی کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ حالی اور آزاد نے جدید مثنوی نگاری کی جو بنیاد ڈالی تھی اس کو مستحکم کرنے میں شبلی کا بہت بڑا حصہ ہے۔

یہ مثنوی ۱۸۸۵ء میں لکھی گئی تھی، ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کے سروں سے جو جوئے خوں گزرنی تھی گزر چکی تھی۔ ان کے قلوب مجروح تھے، مگر وقت اور زمانے نے زخموں کی ٹیس اور شدت میں کچھ نہ کچھ کمی پیدا کرنی شروع کر دی تھی۔ سر سید کی عالی ہمتی دوسروں کی بھی ہمت بندھا رہی تھی اور مسلمان قوم میں یہ جذبہ بیدار ہونے لگا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اپنی عظمتِ رفتہ کو حاصل کر کے مصافِ زندگی میں ایک نئے انداز سے آکر شدائد زمانہ کا مقابلہ کیا جائے۔ چند برسوں قبل حالی اپنا مشہور مسدس مدوجزر اسلام لکھ کر شائع کر چکے تھے اور اس کی صدائے بازگشت اب بھی کانوں میں گونج رہی تھی۔ شبلی کی مثنوی ''صبحِ امید'' جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے نوید امید بن کر

مسلمانوں کی نگاہوں کے سامنے چمکی اور اپنا دیرپا اثر چھوڑ گئی، غالباً حالی ہی کی تقلید میں شبلی نے اپنی مثنوی کی ابتدا اسی زمانہ کے ذکر سے کیا ہے جس کو عروج اسلام کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ شبلی نے اس مثنوی میں سب سے پہلے تو اپنے قارئین کو یہ یاد دلایا ہے کہ

وہ قوم کہ جان تھی جہان کی ——— جو تاج تھی فرق آسمان کی
تھے جس پہ نثار فتح و اقبال ——— کسریٰ کو جو کر چکی تھی پامال
گل کردیئے تھے چراغ جس نے ——— قیصر کو دیئے تھے داغ جس نے
وہ نیزۂ خون فشاں کہ چل کر ——— ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر
روما کے دھوئیں اڑا دیئے تھے ——— اٹلی کو کنوئیں جھنکا دیئے تھے

لیکن جب یہی قوم برگشتۂ طالعی سے دوچار ہوئی تو اس کی یہ حالت ہوگئی۔

تھے جان کے پڑگئے جو لالے ——— ہر سانس پہ لیتی تھی سنبھالے
جس چشمے سے اک جہان تھا سیراب ——— وہ سوکھ کے ہو رہا تھا بے آب
پامال ہوا تھا بوستاں کیا ——— آئی تھی بہار پر خزاں کیا
وہ ابر کہ چھا رہا تھا یکسر ——— دو دن ہوئے کھل گیا برس کر
پستی نے دبا لیا فلک کو ——— خورشید ترس گیا چمک کو
اب خضر کو گمرہی کا ڈر ہے ——— عیسیٰ کو تلاش چارہ گر ہے
جو ابر ابھی برس گیا ہے ——— اک بوند کو اب ترس گیا ہے
اسلام کی جان پر بنی ہے ——— دم توڑ رہا ہے جاں کنی ہے
ہر چند یہ ہو چکی تھی حالت ——— ہم تھے وہی مست خواب راحت
غفلت نے ڈبو دیا تھا ہم کو ——— تقلید نے کھو دیا تھا ہم کو
دشمن کو نہ کرسکے موافق ——— مومن کو بنا دیا منافق
گمراہ تو سیکڑوں بنائے ——— رستے پہ نہ ایک کو بھی لائے
تصنیف میں گالیوں کی بھرمار ——— تحریر کہ لعنتوں کا انبار
سمجھے نہ ذرا کہ وقت کیا ہے؟ ——— کس سمت زمانہ چل رہا ہے؟

ایسے عالم میں ایک خود آگاہ اور خدا آگاہ شخص سرسید احمد آگے بڑھا اور اس نے اپنی قوم کو ذلت و پستی کی گہری خندق سے نکالنے کی مسلسل جدوجہد شروع کی، اپنے ہی اس سے مزاحم ہوئے، علماء نے اس کی تکفیر کی، صرف یہی نہیں بلکہ جو لوگ سرسید کے کفر کے قائل نہ تھے ان کی بھی تکفیر کا بازار گرم رہا، مگر سرسید نے خدا کا نام لے کر جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اس کو وہ اپنے نفس بازپسیں تک انجام دیتے رہے۔ سرسید کی ان مساعی کا نقشہ شبلی نے یوں کھینچا ہے۔

کیا کیا نہ مصیبتیں اٹھائیں — ہر طرح کی ذلتیں اٹھائیں
ناکام رہا صدائیں دے کر — دشنام سنی دعائیں دے کر
کیا تلخ ملے جواب اس کو — کیا کیا نہ دئے خطاب اس کو
خود قوم کو ہوگئی تھی یہ کد — زندیق کہا - کسی نے مرتد
یہ زحمتیں گو تھیں ساتھ اس کے — پُر زور تھے پر جو ہاتھ اس کے
آگے وہ بڑھا ہٹا کے سب کو — طے کر کے رہا رہ طلب کو
آئے تھے جو سنگ راہ بن کر — سب اڑ گئے برگ کاہ بن کر

سرسید کا مشن کامیاب ہوتا نظر آنے لگا۔ وہ جس راہ پر اکیلے گامزن ہوئے تھے اس پر ایک کارواں رواں دواں دکھائی دینے لگا۔ سرسید کے بعد کی نسل کچھ کرنے اور مصاف زندگی میں نبرد آزمائی کے قابل نظر آنے لگی تو ان کے مخالفین کی لے میں کچھ اور تلخی بڑھ گئی۔ سرسید کے مخالفین کو مخاطب کرتے ہوئے شبلی نے کہا

سید سے اگر ہے بغض للہ — وہ خادم قوم اگر ہے گمراہ
کچھ آپ ہی انتظام کرتے — اسلام کو نیک نام کرتے
باتیں نہ فقط بنا کے رہتے — جو منھ سے کہا دکھا کے رہتے
اسلام کی دوستی تو یہ تھی — الفت کی دلیل تھی تو یہ تھی
یہ وقت جو آپڑا ہے مشکل — ہے پردہ کشائے حق و باطل
یاں حال کھلے گا این و آں کا — دنگل ہے وفا کے امتحاں کا
اے مدعیان حب اسلام — حجروں میں تو اب کرو نہ آرام

دعوے ہیں تو کچھ ہنر دکھاؤ
ہمت کے قدم ذرا بڑھاؤ
دیکھو ، رہِ جستجو یہی ہے
میدان یہی ہے، گو یہی ہے
موقع ہے یہی ہنر دکھاؤ
جو کہتے تھے آج کر دکھاؤ
کردو جو گذشتہ کی تلافی
ثابت ہو زمانے پر کہ اب بھی
اسلاف کے وہ اثر ہیں اب بھی
اس راکھ میں کچھ شرر ہیں اب بھی
اس حال میں بھی روش وہی ہے
دن ڈھل بھی گیا طپش وہی ہے
اس جام میں ہے شراب باقی
اب تک ہے گہر میں آب باقی
گو خوار ہیں طرز و خو وہی ہے
مرجھا گئے پھول بو وہی ہے

شبلی کی اس مثنوی کی ایک خصوصیت ہمارے نزدیک یہ ہے کہ ہم اس کو ایک چھوٹا سا منظوم ڈرامہ کہہ سکتے ہیں، جس میں پانچ ایکٹ ہیں اور ہر ایکٹ ایک فارسی شعر سے شروع ہوتا ہے، اس ڈرامے میں اس طرح کے کردار تو نہیں ملتے جس طرح کے کردار ڈرامے میں ہوتے ہیں، مگر اس نظم کا اتار چڑھاؤ اس کو صنف ڈرامہ سے بہت قریب کر دیتا ہے، علاوہ بریں اگر مثنوی ''صبح امید'' کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا جائے کہ یہ مثنوی، مسدس مدو جزر اسلام سے متاثر بھی ہے اور اس کی کسی قدر توسیع بھی کرتی ہے تو امید ہے بہت دلچسپ اور بلند نتائج برآمد ہوں گے، اس تقابلی مطالعے میں یہ بات ذہن میں رکھنی ہوگی کہ حالی اور شبلی کی شخصیتوں میں جو فرق ہے وہی فرق دونوں نظموں میں موجود ہے، حالی کا حلم و بردباری، صبر، تحمل، لہجے کا دھیما پن مسدس مد و جزر اسلام کا خاصہ ہے، اور شبلی کے مزاج کا جوش و خروش، ایک دم سے بھڑک اٹھنے والے جذبات، شدت احساس اور کچھ کر گزرنے کا حوصلہ مثنوی صبح امید کے خصائص ہیں، اسی وجہ سے ہمارے نزدیک شبلی کی یہ مثنوی اردو مثنوی نگاری میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، مگر افسوس ہے کہ اس سمت سفر کرنے کی ہمت بہت ہی کم شاعروں نے کی اور جنھوں نے سفر کیا بھی وہ شبلی کے طرز رفتار کو اپنا نہ سکے، اس لئے کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

یوں تو شبلی کے کلام میں کچھ غزل کے اشعار بھی مل جاتے ہیں اور بعض پوری غزلیں بھی، لیکن کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شبلی کو غزل گوئی سے کوئی خاص رغبت نہ تھی حالانکہ وہ غزل کے بڑے

اچھے پارکھ ہیں، شعر کی روح تک بڑی جلدی پہنچ جاتے ہیں، خود بھی پر جوش اور حساس طبیعت کے مالک ہیں مگر نہ جانے کیوں انھوں نے غزل گوئی کو اپنی جولانگاہ نہیں بنایا، غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ وہ داغ، امیر، اور جلال کے رنگ سخن کی تقلید کر کے خود کو بھی اس رنگ میں نہ رنگنا چاہتے ہوں، لیکن سوال یہ ہے کہ وہ حالی کی جدید غزلوں کی طرح تو غزلیں کہہ سکتے تھے، پھر انھوں نے غزلیں کیوں نہیں لکھیں، ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل کا ایک شعر کسی ہنگامی جذبے کے تحت تو نظم ہوسکتا ہے مگر پوری کی پوری غزل ایک ہی جذبے کے تحت نظم نہیں ہوسکتی، بلکہ اس کے لئے جس ریاض، مینا کاری اور تہذیب جذبات کی ضرورت ہے شبلی اس کے متحمل نہ ہوسکتے تھے، اس لئے انھوں نے اس صنف سخن کو اپنی طبع آزمائی کی جولانگاہ نہیں بنایا۔ بہر حال شبلی کی شاعری میں ان کی غزل گوئی کو کوئی خاص مقام حاصل نہیں ہے۔ ان چند اشعار سے ان کی غزل گوئی کے بارے میں ایک عام اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

تیر قاتل کا یہ احساں رہ گیا ۔۔۔ جائے دل سینہ میں پیکاں رہ گیا
کی ذرا دست جنوں نے کوتہی ۔۔۔ چاک آکر تا بداماں رہ گیا
حسن چمکا یار کا، اب آفتاب ۔۔۔ اک چراغ زیر داماں رہ گیا
دو قدم چل کر ترے وحشی کے ساتھ ۔۔۔ جادۂ راہ بیاباں رہ گیا
قتل ہوکر بھی سبکدوشی کہاں ۔۔۔ تیغ کا گردن پہ احساں رہ گیا
اے جنوں تجھ سے سمجھ لوں گا اگر ۔۔۔ ایک بھی تار گریباں رہ گیا
بزم میں ہر سادہ رو تیرے حضور ۔۔۔ صورت آئینہ حیراں رہ گیا
یاد رکھنا دوستو اس بزم میں ۔۔۔ آکے شبلی بھی غزل خواں رہ گیا

دوسری غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے

کچھ اکیلی نہیں میری قسمت ۔۔۔ غم کو بھی ساتھ لائی ہے
منتظر دیر سے تھے تم میرے ۔۔۔ اب جو تشریف صبا لائی ہے
نکہت زلف، غبار رہ دوست ۔۔۔ آخر اس کوچہ سے کیا لائی ہے
شبلی زار سے کہدے کوئی ۔۔۔ مژدہ وصل صبا لائی ہے

پوچھتے کیا ہو جو حال شب تنہائی تھا
رخصت صبر تھی یا ترک شکیبائی تھا
کون اس راہ سے گذرا ہے کہ ہر نقش قدم
چشم عاشق کی طرح اس کا تماشائی تھا
ہم نے بھی حضرت شبلی کی زیارت کی تھی
یوں تو ظاہر میں مقدس تھا پہ شیدائی تھا

تیس دن کے لئے ترک مے و ساقی کر لوں
واعظ سادہ کو روزوں میں تو راضی کرلوں
پھینک دینے کی کوئی چیز نہیں فضل وکمال
ورنہ حاسد تری خاطر سے میں یہ بھی کرلوں

یار کو رغبت اغیار نہ ہونے پائے
گلِ تر کو ہوس خار نہ ہونے پائے
پھر کہیں جوش میں نہ آجائیں یہ دیدۂ تر
سامنے ابر گہر بار نہ ہونے پائے
آپ جاتے تو ہیں اس بزم میں شبلی لیکن
حالِ دل دیکھئے اظہار نہ ہونے پائے

شبلی نے صنف قصیدہ میں اپنی جس جولانی طبع کا مظاہرہ کیا ہے اس کے صرف چار ہی نمونے ہم تک پہنچ سکے ہیں، ان چار قصائد میں سے بھی دو قصیدے ایسے ہیں جن کو اصطلاحاً قصیدہ کہنا مشکل ہے، کیونکہ وہ کسی کی تعریف وتوصیف میں نظم نہیں کئے گئے ہیں، ان کے صرف دو ہی قصائد ایسے ہیں جو اشخاص کی مدح وتعریف میں لکھے گئے ہیں، اول الذکر قسم کا پہلا قصیدہ ۱۸۹۳ء میں محمڈن

ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھا گیا تھا، یہ قصیدہ اپنے اندازِ بیان اور زبان کی وجہ سے بلاشبہ اردو کے اچھے اور زور دار قصیدوں میں شمار کیا جاسکتا ہے، اس قصیدہ میں شبلی نے پرشکوہ الفاظ کا انتخاب کر کے اپنی بات کہی ہے جس کی وجہ سے اس نظم میں ایک قسم کا جلال اور شان پیدا ہوگئی ہے، لیکن اس قصیدہ کا مقصد کسی کی مداحی نہیں بلکہ قوم کو اس کی زبوں حالی کا احساس دلانا ہے، اس قصیدے کا مطلع یہ ہے:

بجا ہے آج گر اس بزم میں یہ زیب و ساماں ہیں
یہ ان کی بزم ہے جو یادگارِ نسلِ عدناں ہیں

خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے:

سنبھلنا اب بھی گر چاہو تو ہے وقت اور ضرورت بھی
وگرنہ پھر نہیں رہنے کی جو کچھ ہے یہ حالت بھی

اسی طرح کا دوسرا قصیدہ وہ بھی ہے جو ۱۸۹۴ء میں پڑھا گیا تھا اور جس کا مطلع یہ ہے۔

بزم احباب ہے ، پر جوش ہے جلسا کیسا
جم گیا پھر طرب و عیش کا نقشا کیسا

اس قصیدہ کا بھی مقصد صرف یہی ہے کہ قوم کے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کر کے اس کو سراپا عمل بننے کی تلقین کی جائے، اس قصیدے میں بھی اسی انداز بیان اور زبان کا التزام کیا گیا ہے جو قصیدہ نگاری کی بنیادی شرط ہے۔

شخصی قصاید میں ایک قصیدہ تو وہ ہے جو سید محمود کی شادی کے موقع پر لکھا اور پڑھا گیا تھا، یہ قصیدہ محسن کاکوروی کے مشہور زمانہ قصیدہ "سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل" کی زمین اور قافیہ میں لکھا گیا ہے، اس قصیدہ میں تشبیب، گریز اور مدح، قصیدہ کے جملہ اجزاء موجود ہیں، تشبیب کے چند اشعار یہ ہیں۔

پھر ہوا بادِ بہاری کا جو عالم میں عمل
چھا لیا سبزۂ نوخیز نے سب دشت و جبل
ناز سے سوئے چمن جاتی ہے پھر بادِ بہار
جھومتے آتے ہیں پھر صحن چمن میں بادل

سمت قبلہ سے جو اٹھتی ہیں گھٹائیں ہر بار
کہتی ہیں توبۂ زاہد سے کہ اب کی تو سنبھل
نو عروسانِ چمن کے ہیں نرالے انداز
کہ صبا گود میں لیتی ہے تو جاتے ہیں مچل
کچھ عجب شان سے تنتے ہیں جوانان چمن
صحن گلزار ہے یا عیش و طرب کا دنگل

گریز کا شعر یوں ہے۔

چوں بہ غیبت نتواں شرح تمنا گفتن
سخن اکنوں بہ خطاب تو تواں کرد بدل

پھر اس کے بعد سرسید اور سید محمود کی مدح شروع ہوتی ہے، مگر یہ مدح کسی امداد و انعام یا دولت کی لالچ میں نہیں ہے۔ بلکہ ان باپ بیٹوں کے صحیح اور حقیقی اوصاف کو بیان کرنے کے لئے ہے، شبلی کے آخر کے تین شعر ان کے اس قصیدے کو اردو کے دوسرے قصیدوں سے بالکل الگ کر دیتے ہیں، وہ اشعار یہ ہیں۔

مدح مقصود نہیں جوش محبت ہے یہ
میں نہیں وہ کہ لکھوں مدحت اربابِ دول
مجھ کو خود حسن طبیعت پہ ہے اپنی وہ غرور
کہ لکھوں مدح تو اپنا ہی لکھوں علم و عمل
میں بھی ہوں عنصری وقت جو محمود ہے تو
میں بھی ہوں نازِ سلف تو ہے اگر فخر اول

اس قصیدہ کی سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ شاعر یعنی شبلی کو خود اپنی عظمت کا احساس ہے وہ قصیدہ نگاری کو اپنے مرتبہ سے فروتر سمجھتے ہیں اور جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس کو صرف جوش محبت کا تقاضا قرار دیتے ہیں اور یہ درست بھی ہے۔

ان کا صرف ایک قصیدہ ایسا ہے جو کسی بادشاہ کی مدح میں لکھا گیا ہے، یہ قصیدہ ۱۸۷۹ء میں

شبلی نے ترکی کے سلطان عبدالحمید خان کی مدح میں نظم کیا تھا جن کو خلیفۃ المسلمین کی بھی حیثیت حاصل تھی، یعنی وہ صرف ترکی کے بادشاہ ہی نہیں تھے بلکہ تمام عالم کے مسلمانوں کے خلیفہ بھی سمجھے جاتے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ سلطان عبدالحمید کی مدح میں شبلی جو قصیدہ لکھنا چاہتے تھے وہ لکھ نہ پائے، انھوں نے تشبیب کے چودہ اشعار لکھے اس کے بعد مدح سے ان کی طبیعت ہٹ گئی، اس طرح یہ قصیدہ ناتمام رہا، بعد میں یہ اشعار کلیات شبلی کے مرتب مولانا سید سلیمان ندوی نے قصیدہ کے عنوان سے کلیات میں شامل کر لئے، لیکن ہمارے نزدیک یہ صرف تشبیب کے اشعار ہیں مکمل قصیدہ نہیں۔

بہر حال شبلی کی قصیدہ نگاری کی خصوصیت صرف یہ ہے کہ وہ قصیدہ لکھتے وقت اسی انداز اور زبان کو استعمال کرتے ہیں جس کو قدما استعمال کرتے تھے، ورنہ ان کے قصائد نہ تو اصطلاحی معنوں میں قصائد ہیں اور نہ ہی ان کی غیور طبیعت اس کی متحمل ہو سکتی تھی۔

شاعر شبلی کے اصل جلوے ان نظموں میں دکھائی دیتے ہیں، جن کو مولانا سید سلیمان ندوی نے ''جدید نظمیں'' کا نام دیا ہے، یہ نظمیں بھی دو نوع کی ہیں، ایک تو وہ ہیں جن میں شبلی نے کسی تاریخی واقعہ کو شاعرانہ انداز سے نظم کیا ہے اور دوسری طرح کی نظمیں وہ ہیں جو عصر شبلی کے ان مسائل پر لکھی گئی ہیں جو اس زمانے میں ہیجان برپا کیے ہوئے تھے، اس نوع کی شاعری کو پروفیسر کبیر احمد جائسی نے لمحاتی شاعری کا نام دیتے ہوئے شبلی کی ان نظموں کے بارے میں یوں اظہار خیال فرمایا ہے۔

> ''انھوں نے ان لمحاتی موضوعات پر بلند پایہ اور پر جوش نظمیں لکھیں جو قوم و فرد کی حیات جاوداں کے ترجمان ہوتے ہیں، گویا کہ انھوں نے لمحاتی موضوعات کو اپنے قلم سے ابدی و جاوداں بنا دیا، مثلاً ان کا یہ شعر

پہنائی جا رہی ہیں عالمان دیں کو زنجیریں
یہ زیور سید سجاد عالی کی وراثت ہے

یا یہ شعر:

پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
ہم کشتگان معرکہ کانپور ہیں

صرف ایک لمحاتی واقعہ کی یادگار بن کر نہیں رہ جاتا بلکہ اس لمحہ کی ترجمانی میں قوم و فرد

کی زندگی، ساری کوششیں اور زندہ رہنے کے سارے حوصلے بے نقاب ہو جاتے ہیں، یہ وہی سرمایہ ہے جو شبلی سے جدید اردو شاعری کو ملا۔" (۴)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس نوع کی نظمیں جن مسائل کے گرد گھومتی ہیں ان سب کو لمحاتی مسائل کہا جا سکتا ہے، مگر شبلی کی شاعرانہ صناعی کا کارنامہ یہ ہے کہ ان مسائل کو ختم ہوئے تقریباً پون صدی گزر چکی ہے، مگر ان کے اشعار کی معنویت، جاذبیت اور کاٹ آج بھی زندہ ہے، وہ خواہ جنگ بلقان پر اظہار خیال کریں، خواہ مسلم یونیورسٹی کے مسائل پر، مسلم لیگ کے پوست کندہ حالات بیان کریں، خواہ کانپور کی مسجد کی شہادت پر اپنے جذبات کا اظہار کریں، ان کے اشعار کی آبداری آج تک ماند نہیں ہونے پائی، دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ موضوعات تو ہیجانی اور لمحاتی ضرور تھے مگر شبلی نے ان کو جس فنکارانہ انداز سے پیش کیا ہے اسی انداز کی وجہ سے وہ ایسے ادب پاروں میں ڈھل گئے ہیں جن کی معنویت آج بھی برقرار ہے، غالباً یہی وجہ ہے "شہر آشوب اسلام" کے اشعار ہوں یا "ہم کشتگان معرکۂ کانپور ہیں" کے اشعار، "علمائے زندانی" کے اشعار ہوں یا "آپ ظالم نہیں زنہار پہ ہم ہیں مظلوم" کے اشعار آج بھی اسی طرح تروتازہ ہیں اور آج بھی دوسرے دوسرے واقعات وحوادث کا ان پر انطباق کرتے ہوئے ان کو دہرایا جا سکتا ہے، مثلاً "شہر آشوب اسلام" کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیے پرزے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک
مراکش جا چکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ سخت جاں کب تک
یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں تک
یہ سب ہیں رقص بسمل کا تماشا دیکھنے والے

یہ سیر ان کو دکھائے گا شہید نیم جاں کب تک
یہ وہ ہیں نالۂ مظلوم کی لے جن کو بھاتی ہے
یہ راگ ان کو سنائے گا یتیم ناتواں کب تک
کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تاکے یہ حشر انگیزیاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک
یہ مانا گرمی محفل کے ساماں چاہئیں تم کو
دکھائیں ہم تمہیں ہنگامۂ آہ وفغاں کب تک
یہ مانا قصۂ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے
سنائیں تم کو اپنے دردِ دل کی داستاں کب تک
یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خوں سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کب تک

یا ''ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں'' کے یہ اشعار، جن کو ماہ وسال کی گردش بھی گرد وغبار سے آلودہ نہ کرسکی۔

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لئے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آگئی ہے، منتظر نفخ صور ہیں
کچھ نوجواں ہیں، بے خبر نشۂ شباب
ظاہر میں گرچہ صاحب عقل و شعور ہیں

اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ
مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں
سینہ پہ ہم نے روک لئے برچھیوں کے وار
از بس کہ مست بادۂ ناز و غرور ہیں
ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر
لذت شناس ذوق دل ناصبور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا
جو خاک وخوں میں بھی ہمہ تن غرق و نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
''ہم کشتگان معرکۂ کانپور ہیں''

یا پھر''علمائے زندانی'' کے یہ اشعار جن میں آج بھی شبلی کا دھڑکتا ہوا دل زندہ وتابندہ ہے۔

پہنائی جارہی ہیں عالمان دیں کو زنجیریں
یہ زیور سید سجاد عالی کی وراثت ہے
یہی دس بیس اگر ہیں کشتگان خنجر اندازی
تو مجھ کو سستی بازوئے قاتل کی شکایت ہے
شہیدان وفا کے قطرۂ خوں کام آئیں گے
عروسِ مسجدِ زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے
عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
کہ یہ بچے ہیں ان کو جلد سوجانے کی عادت ہے

اسی طرح کی نظم وہ بھی ہے جس کا عنوان''خیر مقدم ڈاکٹر انصاری'' ہے، یہ نظم اس دور کی یادگار ہے جب بلقان کے زخمی فوجیوں کی بھرپور خدمت کرنے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کا طبی وفد اپنے وطن واپس پہنچا تھا، یہ نظم جس دور کی یادگار ہے اس زمانے میں ترکی کو تمام عالم اسلام کا دھڑکتا ہوا دل سمجھا جاتا تھا اور اگر ترکوں کو کوئی پھانس چبھتی تھی تو وہ پورے عالم اسلام کو ضرب شمشیر

محسوس ہوتی تھی، بدقسمتی سے ترکی کو طرابلس اور بلقان کی جنگ میں الجھنا پڑا، اس نازک موقع پر عالم اسلام کے ممالک نے اپنی اپنی بساط بھر ترکوں کی مدد کی، مسلمانان ہند اپنی غلامی کے باوجود کسی سے پیچھے نہ رہے ایک طرف تو انھوں نے چندہ کر کے لاکھوں روپے حکومت ترکی کی نذر کئے اور عملی خدمات انجام دینے کے لئے ڈاکٹر انصاری مرحوم کی سربراہی میں ایک طبی وفد بھیجا، جس نے ترکی میں جا کر محاذ جنگ پر پہونچ کر نبرد آزما ترکوں کی عملی خدمت کی شبلی کی اس نظم کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں انھوں نے وفد کے اپنے وطن واپس آنے پر خدا کا شکر ادا کیا ہے اور اس وفد کو ''سوز اسلامی'' کا امین قرار دیا ہے، اس نظم کا دوسرا حصہ پہلے حصے کے مقابلے میں زیادہ جذباتی اور جوش وخروش سے معمور ہے، اس حصے میں شبلی نے ترکوں کی اس تباہی و بربادی کی عکاسی کی ہے جس کا مشاہدہ وفد کے ارکان نے بچشم خود کیا تھا، اس حصے کے اشعار میں اس کرب کی بھی زیریں لہریں محسوس کی جاسکتی ہیں جو عالم اسلام کے انحطاط وزوال کو محسوس کر کے شبلی کے دل پر طاری تھا، یہ تمام اشعار اس قابل ہیں کہ ان کو یہاں نقل کر دیا جائے۔

مسلمانوں کے تم نے طالع واژوں بھی دیکھے ہیں
نئے سب انقلاب گردش گردوں بھی دیکھے ہیں
تمہارا درد دل سمجھیں گے کیا ہندوستاں والے
کہ تم نے وہ مظالم ہائے روز افزوں بھی دیکھے ہیں
یتیموں کے سنے ہیں نالہ ہائے جاں گزا تم نے
زنان بے نوا کے چہرۂ محزوں بھی دیکھے ہیں
گھروں کو لوٹنے کے بعد زندوں کو جلادینا
بلاد مغربی کے یہ نئے قانوں بھی دیکھے ہیں
مسلمانوں کا قتل عام اور ترکوں کی بربادی
نتائج ہائے امید گلیڈسٹوں بھی دیکھے ہیں
تمہیں نے غازیوں کے زخم پر ٹانکے لگائے ہیں
شہیدان وطن کے جامۂ پر خوں بھی دیکھے ہیں

تمہاری چشم عبرت گیر خود ہم سے یہ کہتی ہے
کہ ہم نے وہ مصائب ہائے گوناگوں بھی دیکھے ہیں
نگار آرائیاں دیکھی ہیں چشم گوہر افشاں کی
شہیدان وفا کے عارض گلگوں بھی دیکھے ہیں
تمہیں سے کچھ پتہ ملتا ہے شیدایان ملت کا
کہ تم نے شاہد اسلام کے مفتوں بھی دیکھے ہیں
جنوں جوش اسلامی کوئی سمجھا تو تم سمجھے
کہ تم نے لیلی اسلام کے مجنوں بھی دیکھے ہیں
سہارا ہے اگر امید کا اب بھی کوئی باقی
تو تم نے وہ رموز قوت مکنوں بھی دیکھے ہیں
عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہوکر پھر اچھل آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

اس حصے کا یہ شعر:

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہوکر پھر اچھل آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

خاص طور سے قابل غور ہے، اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی عالم اسلام کے مستقبل سے مایوس نہیں تھے، ان کی رجائیت ان کو اس بات کا خواب دکھائے رہتی تھی کہ ''انقلاب چرخ گردوں'' مسلمانوں کے رو بہ زوال حالات کو سنبھال لے گا اور ایک بار پھر ان سے دنیا کی سیادت اور امامت کا کام لیا جائے گا۔

مسلم لیگ سے متعلق ان کی نظموں میں شمشیر کی سی تیزی اور آبداری ہے، کوئی شبلی کے افکار و خیالات سے متفق ہو یا نہ ہو لیکن ان کے اشعار کی آبداری اور کاٹ ہر شخص ضرور محسوس کرے گا، اب ہم ان نظموں کے چند اشعار بغیر کسی نقد و تبصرہ کے صرف مثالوں کے لئے نقل کرتے ہیں:

لیگ کی عظمت و جبروت سے انکار نہیں
ملک میں غلغلہ ہے شور ہے، کہرام بھی ہے
ہے گورنمنٹ کی بھی اس پہ عنایت کی نگاہ
نظرِ لطف رئیسانِ خوش انجام بھی ہے
کوئی ہے جو نہیں اس حلقۂ قومی کا اسیر
اس میں زہاد بھی ہیں رند مے آشام بھی ہے
فیض اس کا ہے باندازۂ طالب، یعنی
بادۂ صاف بھی ہے، دردِ تہہ جام بھی ہے
پختہ کاروں کے لئے آلۂ تسخیر ہے یہ
نوجوانوں کو صلائے طمعِ خام بھی ہے
رہنمایانِ نو آموز کا ہے مکتبِ درس
زینۂ فخر و نمائش گر عام بھی ہے
جن مہمات میں درکار ہے ایثار نفوس
ان میں طرزِ عمل بوسہ و پیغام بھی ہے
مختصر اس کے فضائل کوئی پوچھے تو یہ ہیں
محسنِ قوم بھی ہے، خادمِ حکام بھی ہے
اس کے آفس میں بھی ہر طرح کا سامان ہے درست
ورقِ سادہ بھی ہے، کلکِ خوش اندام بھی ہے
ہیں قرینے سے سجائی ہوئی میزیں ہر سو
جابجا دفترِ پارینۂ احکام بھی ہے
چند بی اے ہیں، سند یافتۂ علم و عمل
کچھ اسسٹنٹ ہیں کچھ حلقۂ خدام بھی ہے

یہ تو سب کچھ ہے مگر ایک گزارش ہے حضور
گرچہ سوء ادب بھی ہے، اور ابرام بھی ہے
مجھ سے آہستہ مرے کان میں ارشاد ہو یہ
''سال بھر حضرت والا کو کوئی کام بھی ہے

ایک دوسری نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

لیگ کو جب نظر آیا کہ چلی ہاتھ سے قوم
اک نیا روپ بھرا اس نے بہ انداز دگر
منظر عام پہ لوگوں سے کیا اس نے خطاب
کہ نہیں سلف گورنمنٹ سے اب ہم کو مفر
اک ذرا سی مگر اس لفظ میں تخصیص بھی ہے
جس سے ہیں متفق اللفظ سب ارباب نظر
یعنی وہ سلف گورنمنٹ کہ ہو ''سوٹ ایبل''
یا کہ موزوں و مناسب ہو بالفاظ دگر
یہ مسلم کہ ہر اک ملک کی حالت ہے جدا
جس کا آئین حکومت پہ بھی پڑتا ہے اثر
جو حکومت کہ کناڈا کے لئے ہے موزوں
ہے وہی مملکت ہند میں سرمایۂ شر
ملک میں ہم بھی ہیں ہندو بھی ہیں عیسائی بھی
جو کہ ہیں نخل حکومت کے لئے برگ و ثمر

اب ہم شبلی کی دوسری نوع کی ان نظموں پر بھی ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں جن کا تعلق تاریخی واقعات سے ہے، بقول علامہ سید سلیمان ندوی ''اہل بیت رسول اللہ ﷺ کی زندگی'' شبلی کی وہ نظم ہے جو ان کی زندگی کی آخری نظم ہے۔(۵)

ہم اپنے مطالعے کی ابتدا اس نظم سے کرتے ہیں، یہ نظم چودہ اشعار پر مشتمل ہے، جس کا

پہلا شعر، مطلع نہیں فرد ہے، اس نظم کی ہیئت قصیدہ اور غزل والی ہے، نظم کا موضوع بی بی فاطمہؓ کی زندگی ہے، شبلی نے اس نظم کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلے حصے میں انھوں نے بی بی فاطمہؓ کے افلاس کا حال ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

افلاس سے تھا سیدۂ پاک کا یہ حال
گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں
چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا
سینہ پہ مشک بھر کے جو لاتی تھیں بار بار
گو نور سے بھرا تھا مگر نیل فام تھا
اٹ جاتا تھا لباس مبارک غبار سے
جھاڑو کا مشغلہ بھی جو ہر صبح و شام تھا

اس پریشانی کے عالم میں بی بی فاطمہؓ سرور کائنات ﷺ سے اپنی حالت عرض کرنے تشریف لے گئیں، لیکن چونکہ وہاں پر صحابۂ کرام کا مجمع تھا اور بہت سے غیر محرم حضرات بھی وہاں تشریف رکھتے تھے اس لئے بغیر کچھ عرض کئے وہ واپس آگئیں، جب دوبارہ آپؐ سرور کائنات ﷺ کے پاس تشریف لے گئیں تو آپ ﷺ نے دریافت کیا کہ وہ کس لئے آئی تھیں، بی بی فاطمہؓ کو اپنی بات کہتے ہوئے حیا محسوس ہو رہی تھی اس لئے حضرت علیؓ نے سرور کائنات ﷺ کو ان کی آمد کی غرض سے مطلع کیا، حضرت علیؓ کی زبان سے پوری بات سننے کے بعد سرور کائنات ﷺ نے جو کچھ ارشاد فرمایا شبلی نے اس کو اس طرح نظم کیا ہے:

ارشاد یہ ہوا " کہ غریبان بے وطن
جن کا کہ صفۂ نبوی میں قیام تھا
میں ان کے بند وبست سے فارغ نہیں ہنوز
ہر چند اس میں خاص مجھے اہتمام تھا

جو جو مصیبتیں کہ اب ان پر گزرتی ہیں
میں ان کا ذمہ دار ہوں میرا یہ کام تھا
کچھ تم سے بھی زیادہ مقدم ہے ان کا حق
جن کو کہ بھوک پیاس سے سونا حرام تھا

درج بالا اشعار میں جو بات کہی گئی ہے وہ ایک پیغمبر ہی کی زبان سے ادا ہوسکتی ہے، آپ ﷺ نے اپنی صاحب زادی کی ضرورت پر ان لوگوں کی ضرورت کو مقدم سمجھا جن کا کوئی ٹھکانا نہ تھا اور وہ مسجد نبوی کے چبوترے پر دن رات پڑے رہتے۔ اسی لئے اہل صفہ کہلاتے۔ شبلی نے ان اشعار میں اس بات کی تصویر کشی کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک اولاد سے زیادہ وہ لوگ قابل توجہ تھے جو ان کے پیغام پر لبیک کہتے ہوئے ساری دنیا کو تج کر صرف خدا کی خوشنودی کے لئے بے سروسامانی کی زندگی گذار رہے تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ سلم نبی ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی ریاست کے سربراہ بھی تھے اس لئے انھوں نے اولاد سے پہلے امت کے آرام و اطمینان کا انتظام فرمانے کو مقدم سمجھا، حضور اکرم ﷺ کا جواب سن کر بی بی فاطمہؓ پر جو تاثر قائم ہوا وہ شبلی کے الفاظ میں یہ ہے:

خاموش ہو کے سیدۂ پاک رہ گئیں
جرأت نہ کرسکیں کہ ادب کا مقام تھا
یوں کی ہے اہل بیت مطہر نے زندگی
یہ ماجرائے دختر خیر الانامؐ تھا

شاعری کے فن کے لحاظ سے یہ نظم کسی خاص جدت یا ندرت کی حامل نہیں ہے، نہ ہی اس کی زبان میں کوئی شکوہ ملتا ہے، یہ ایک سیدھی سادی اور حقائق سے پُر نظم ہے اور اس کی اہمیت صرف اس لئے ہے کہ شبلی نے ایک ایسے واقعہ کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دل کو لگنے والا بھی ہے۔

اسی طرح کی ان کی ایک دوسری مشہور نظم "عدل جہانگیری" ہے، جس میں تاریخ ہند کا ایک واقعہ نظم ہوا ہے، شبلی کی منظومات کا جو کلیات ان کے لائق شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی نے

مرتب کیا ہے اس میں اس بات کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے کہ ان منظومات کا سنِ تحریر کہیں درج نہیں ہے، اس لئے ہم یہ کہنے سے تو قاصر ہیں کہ شبلی نے یہ نظم کب لکھی تھی، مگر اس کا جوش بیان اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ یہ نظم ان کی زندگی کے اس دور کی یادگار ہے جس میں ان کے جذبات لاوے کی طرح ابلتے رہتے تھے۔ شبلی تو کیا اردو کے کسی دوسرے شاعر نے کوئی منظوم ڈرامہ نہیں لکھا ہے مگر شبلی کی اس نظم میں جو ڈرامائی انداز بیان ہے اس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

شبلی نے اس نظم کو چار ٹکڑوں میں تقسیم کیا ہے، لیکن اس کی بحر اور قافیہ میں انھوں نے کوئی تبدیلی نہیں کی ہے۔ اول الذکر نظم ہی کی طرح یہ نظم بھی قصیدہ یا غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہے اور اس میں ردیف کا کوئی التزام نہیں کیا گیا ہے، تا کہ ان کی فکر غیر ضروری پابندیوں میں مقید ہو کر نہ رہ جائے۔ نظم کی ابتدا اس ڈرامائی انداز سے ہوتی ہے۔

قصرِ شاہی میں کہ ممکن نہیں غیروں کا گذر
ایک دن ''نور جہاں'' بام پہ تھی جلوہ فگن
کوئی شامت زدہ رہ گیر ادھر آ نکلا
گرچہ تھی قصر میں ہر چار طرف سے قدغن
غیرتِ حسن سے بیگم نے طپنچہ مارا
خاک پر ڈھیر تھا اک کشتۂ بے گور و کفن

شبلی نے اپنی بات کو شروع کرنے کے لئے نہ تو کوئی تمہید باندھی ہے اور نہ ہی مناظر قدرت کی عکاسی کر کے قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی ہے، پہلے شعر کے فوراً ہی بعد قصر شاہی میں ایک راہ گیر کے آ جانے کا ذکر ہے اور تیسرے شعر میں اس راہ گیر کا قصہ ہی پاک ہو کر رہ جاتا ہے، غالباً شبلی نے اپنے قاری کے ذہن کو چونکا دینے کے لئے یہ انداز بیان اختیار کیا ہے۔

نظم کے دوسرے حصے میں شبلی نے اس واقعہ سے جہانگیر کے واقف ہونے اور اس کے بعد اس پر طاری ہونے والے ردعمل کی تصویر کشی کی ہے، نور جہاں اقبالی مجرم ہے لیکن اس کا عذر یہ ہے کہ اس نے جو کچھ کیا وہ ''ناموس حیا'' کا تقاضا تھا اور کچھ نہیں، ان مکالموں کو شبلی نے یوں نظم کیا ہے:

2092

ساتھ ہی شاہ جہانگیر کو پہنچی جو خبر
غیظ سے آگئی ابروئے عدالت پہ شکن
حکم بھیجا کہ کنیزان شبستان شہی
جاکے پوچھ آئیں کہ سچ یا کہ غلط ہے یہ سخن
نخوت حسن سے بیگم نے بصد ناز کہا
میری جانب سے کرو عرض بہ آئین حسن
ہاں مجھے واقعۂ قتل سے انکار نہیں
مجھ سے ناموس حیا نے یہ کہا تھا کہ ''بزن''
اس کی گستاخ نگاہی نے کیا اس کو ہلاک
کشور حسن میں جاری ہے یہی شرع کہن

اس بند میں شبلی نے نور جہاں کی زبان سے جو الفاظ کہلوائے ہیں وہ ایک ملکہ کے شایان شان ہیں، اس کے لئے انھوں نے ''نخوت حسن'' ''ناموس حیا'' ''گستاخ نگاہی'' اور ''کشور حسن'' کی تراکیب کو نظم کرکے یہ دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ یہ الفاظ ایک مَلِکَہ کی زبان سے ادا ہورہے ہیں کسی معمولی عورت کی زبان سے نہیں۔

نظم کے تیسرے ٹکڑے میں شبلی نے مفتی شرع کی بے خوفی، اس کا فیصلہ، فیصلے کا درباریوں پر ردعمل، پھر جہانگیر کا ترکنوں کو یہ حکم دینا کہ وہ نور جہاں کو ایک عام قیدی کی طرح گرفتار کرکے لے آئیں تاکہ اس کو قتل کردیا جائے، سب کچھ اس انداز سے نظم کردیا ہے کہ سارے واقعات ہماری نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگتے ہیں، اسی سلسلۂ سخن میں شبلی یہ بھی یاد دلا دینا چاہتے ہیں کہ اس ''اقبال جرم'' سے پہلے نور جہاں کی کیا حیثیت تھی۔

یہ وہی نور جہاں ہے کہ حقیقت میں یہی
تھی جہانگیر کے پردہ میں شہنشاہِ زمن
اس کی پیشانی نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ
جاکے بن جاتی تھی اوراقِ حکومت پہ شکن

اب نہ وہ نور جہاں ہے ، نہ وہ اندازِ غرور
نہ وہ غمزے ہیں ، نہ وہ عربدۂ صبر شکن
اب وہی پانوں ہر اک گام پہ تھراتے ہیں
جن کی رفتار سے پامال تھے مرغانِ چمن
ایک مجرم ہے کہ جس کا کوئی حامی نہ شفیع
ایک بیکس ہے کہ جس کا نہ کوئی گھر نہ وطن

نظم کے چوتھے اور آخری ٹکڑے میں شبلی نے دو تصویریں پینٹ کی ہیں، پہلی تصویر تو ملزم نور جہاں کی ہے، جو شہنشاہ عادل کو یہ یاد دلاتی ہے کہ شریعت کی رو سے ''خوں بہا'' ادا کرنے کے بعد مجرم بری کر دیا جاتا ہے، عادل بادشاہ ایک بار پھر مفتی شرع سے استصواب کرتا ہے کہ مجرمہ جو کچھ کہہ رہی ہے اس کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ وہی مفتی شرع جس نے بلا رو رعایت اعلان کیا تھا کہ ''شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اڑادو گردن'' بادشاہ کو بتلاتا ہے کہ اگر مقتول کی بیوی اور بچے خون بہا پر راضی ہوں تو مجرمہ اپنے اس جرم سے بری کی جاسکتی ہے، مجرمہ ملکۂ نور جہاں مقتول کے وارثوں کو ایک لاکھ درہم خون بہا کے طور پر دیتی ہے اور وہ آکر بادشاہ سے عرض کرتے ہیں کہ ہم کو مقتول کا قصاص مطلوب نہیں ہے، اس لئے اگر مجرمہ کو قتل کی سزا سے بری کر دیا جائے تو بہتر ہے، دوسری تصویر یہ ہے کہ جب ہر طرح سے جہاں گیر کو یقین ہو گیا کہ مقتول کے ورثہ خون بہا لینے پر راضی ہیں اور شریعت بھی اس کی اجازت دیتی ہے تو وہ مطمئن ہو کر حرم سرا میں نور جہاں سے ملنے جاتا ہے، اس مرحلہ کو شبلی نے صرف دو اشعار میں بیان کیا ہے۔

اٹھ کے دربار سے آہستہ چلا سوئے حرم
تھی جہاں نور جہاں معتکفِ بیتِ حزن
دفعۃً پانوں پہ بیگم کے گرا اور یہ کہا
''تو اگر کشتہ شدی ، آہ چہ می کردم من''

نظم کا آخری مصرع اپنے اندر جو جہان معانی رکھتا ہے اس کی تفصیل شاید ہی کسی ناقد کا قلم بیان کر سکے، ''تو اگر مار ڈالی جاتی تو میں کیا کرتا'' کہہ کر جہاں گیر نے اپنی وہ قلبی محبت ظاہر کر دی جو

اس کو نور جہاں سے تھی، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علامہ شبلی نے اس نظم میں ایک چھوٹا سا ڈرامہ تصنیف کر دیا ہے جس کا خاتمہ بھی بڑے چونکا دینے والے انداز سے ہوتا ہے۔

کلیات شبلی میں صرف ایک مرثیہ ملتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس صنف میں کئی یادگاریں نہیں چھوڑی ہیں، ورنہ سید صاحب ان کو بھی کلیات میں شامل کر دیتے، مذکورہ مرثیہ واقعات کربلا سے متعلق نہیں ہے بلکہ شخصی ہے جس میں علامہ شبلی نے اپنے چھوٹے بھائی کے سانحۂ ارتحال پر اپنے تاثرات نظم کئے ہیں اردو زبان میں شخصی مرثیے کم ہی لکھے گئے ہیں، جہاں تک ہمارے علم میں ہے متقدمین کے دور میں شخصی مرثیے لکھنے کا رواج نہ تھا بلکہ صرف تاریخ وفات منظوم کرتے وقت اپنے دلی جذبات کا اظہار کر دیا جاتا، متوسطین میں غالب کا مرثیہ 'عارف' اور ان کے معاً بعد کے دور میں حالی کا مرثیہ 'غالب' اس کی بہترین مثالیں ہیں، علامہ شبلی کا مرثیہ ان ہی مرثیوں کی یاد دلاتا ہے، غالب نے عارف کا جو شخصی مرثیہ لکھا ہے وہ غزل اور قصیدہ کی ہیئت میں ہے اور حالی نے جو شخصی مرثیہ لکھا ہے وہ ترکیب بند کی ہیئت میں لکھا گیا ہے، لیکن شبلی نے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے مسدس کی ہیئت کو اختیار کیا، انیس و دبیر کے جتنے بھی مشہور زمانہ مرثیے ہیں وہ مسدس ہی میں لکھے گئے ہیں، ان دونوں باکمالوں نے مسدس میں ایسے مرثیے لکھے ہیں کہ اب مسدس اور مرثیہ لازم وملزوم ہو کر رہ گئے ہیں۔

جب کسی شاعر کو اس ہیئت میں اظہار خیال کرنا ہوتا ہے تو اس کو ہر بند کے پانچویں اور چھٹے مصرعے پر خاص طور سے دھیان رکھنا ہوتا ہے، اس ٹیپ کی اہمیت یہ ہوتی ہے کہ یہ ایک بند کو دوسرے بند سے جدا کرتا ہے، چونکہ اس کے ردیف اور قوافی اوپر کے چاروں مصرعوں کے ردیف و قوافی سے مختلف ہوتے ہیں اس لئے اور بھی شاعر کو اپنی فنکاری کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے اور ایک ایسا شعر لکھنا ہوتا ہے جو اوپر کے دونوں اشعار سے اس طرح پیوست ہو جائے کہ اگر اس کو اوپر کے دونوں اشعار سے جدا کر دیا جائے تو وہ اشعار نامکمل سے محسوس ہونے لگیں، شبلی کے زیر بحث مرثیہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے ایسے ٹیپ کے اشعار لکھے ہیں جو اپنے سابقہ اشعار سے پیوست ہو گئے ہیں، مثال کے طور پر ٹیپ کے یہ اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں:

اب وہ مجموعۂ اخلاق کہاں سے لاؤں
ہائے افسوس میں اسحاق کہاں سے لاؤں

یعنی وہ آئینۂ خوبیِ اخلاق تو ہے
اٹھ گیا مہدی مرحوم تو اسحاق تو ہے

گلۂ خوبیِ تقدیر رہا جاتا ہے
نوجواں جاتے ہیں اور پیر رہاجاتا ہے

کوششوں کے جو نتیجے تھے اسے مل نہ سکے
ہائے وہ پھول کہ پھولے تھے مگر کھل نہ سکے

چھوڑ کر بچوں کو بے صبر و سکوں جاتا ہے
کوئی جاتا ہے جو دنیا سے تو یوں جاتا ہے

لاڈلے ہیں کہ کسی اور کے بس کے بھی نہیں
اس کے بچے ابھی سات آٹھ برس کے بھی نہیں

شبلی کے مرثیہ میں نہ تو مناظر قدرت کی تصویر کشی ہے، نہ رزم و بزم کی عکاسی، نہ تو چہرہ ہے اور نہ ہی وہ صفتیں ہیں جن کا اضافہ بعد کے مرثیہ نگاروں نے کیا ہے مگران تمام باتوں کے باوجود ان کا مرثیہ دل پر اثر کرتا ہے، انھوں نے ایسے صادق جذبات کی عکاسی کی ہے جو ہر شخص کے جذبات سے ملتے جلتے ہیں اسی لئے ان کا ہر قاری ان کے تجربے میں شریک ہو کران کا ذہنی ہم سفر

بن جاتا ہے، اگر چہ مرثیہ شدت جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر لکھا گیا ہے تاہم اس میں ایک نوع کی ہوشمندی بھی ملتی ہے اور اس کا ایک مصرع بھی ایسا نہیں ہے جس پر مبالغہ کا اطلاق ہو، مزید برآں شبلی کے ان اشعار کی زبان ہر طرح کے تصنع اور تکلف سے پاک نظر آتی ہے غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے یہ مرثیہ اپنے شاعرانہ کمالات کے اظہار کے لئے نہیں بلکہ بیان احوال واقعی کے طور پر لکھا تھا، ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کی تصدیق درج ذیل اشعار سے ہو جائے گی:

تازہ تھا دل پہ مرے مہدی مرحوم کا داغ
کہ مرا قوت بازو تھا، مرا چشم و چراغ
اس کو جنت میں جو خالق نے دیا کنج فراغ
میں یہ کہتا تھا کہ اب بھی تروتازہ ہے یہ باغ
یعنی وہ آئینۂ خوبی اخلاق تو ہے
اٹھ گیا مہدی مرحوم تو اسحاق تو ہے

آج افسوس کہ وہ نیر تاباں بھی گیا
میری جمعیتِ خاطر کا وہ ساماں بھی گیا
اب وہ شیرازۂ اوراقِ پریشاں بھی گیا
عقبۂ والدِ مرحوم کا درباں بھی گیا
گلۂ خوبی تقدیر رہا جاتا ہے
نوجواں جاتے ہیں اور پیر رہا جاتا ہے

آہ اے مرگ کسی شے کی نہیں تجھ کو تمیز
تیری نظروں میں برابر ہے گہر اور پشیز
میں نے مانا ترے نزدیک نہ تھا وہ کوئی چیز
رحم کرنا تھا کہ چھوڑے ہیں کئی اس نے عزیز

لاڈلے ہیں کہ کسی اور کے بس کے بھی نہیں
اس کے بچے ابھی سات آٹھ برس کے بھی نہیں

اس مقام پر ہم پھر اپنی بات کا اعادہ کریں گے کہ شبلی نے جو مرثیہ لکھا ہے وہ اظہار کمال کے لئے نہیں بلکہ اپنے جگر کے ٹکڑے کاغذ کے صفحات پر نکال کر رکھ دیے ہیں۔

شبلی نے شاعری کو کبھی بھی اپنے لئے ذریعۂ عزت نہیں سمجھا، ان کی فارسی غزلیں تو ان کی زندگی میں بوئے گل اور دستۂ گل کے ناموں سے شائع ہو کر ان کے مداحوں کے ہاتھوں تک پہنچیں بھی، مگر ان کا اردو کلام اخباروں کے صفحات میں محصور رہا جس کو ان کے انتقال کے کئی برسوں کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی نے مرتب کر کے شائع کیا، شبلی نے تو اپنے اردو کلام کو بے اعتنائی کی نگاہوں سے دیکھا مگر ہمارے نزدیک ان کے کئی جواہر پارے ایسے ہیں جو اردو شاعری کے بقائے دوام کے دربار میں ان کی جگہ کو محفوظ رکھیں گے، اس سلسلے میں ہم کو ڈاکٹر سلام سندیلوی صاحب کی درج ذیل رائے سے پورا پورا اتفاق ہے۔ وہ شبلی کی اردو شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''میرا خیال ہے کہ اگر اردو کی بہترین نظموں کا کوئی انتخاب شائع کیا جائے تو اس میں شبلی کی چار نظموں کو یعنی ''عدل جہانگیری'' ''شہر آشوب اسلام'' ''خیر مقدم ڈاکٹر انصاری'' اور ''ہم کشتگان معرکہ کانپور ہیں'' کو آسانی سے شامل کیا جا سکتا ہے، اگر شبلی زیادہ نظمیں نہ کہتے اور صرف انھیں چار نظموں کے خالق ہوتے تو اس وقت بھی شبلی کو ایک اچھا شاعر کہنے میں کسی کو تامل نہیں ہوتا۔ شبلی کی شاعرانہ عظمت کا ایک ثبوت اور بھی ہے کہ انھوں نے اسلامی نظمیں کہہ کر اردو میں ایک طرح نو ڈالدی۔''(۶)

☆☆☆

حواشی:

(۱) کلیات شبلی اردو، مطبع دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۱ء، ص ۲

(۲) کلیات شبلی، ص ۳

(۳) کلیات شبلی، ص ۳

(۴) نیرنگ نظر، مرتبہ ابن فرید، مضمون کبیر احمد جائسی، ۱۹۷۰ء، ص ۲۵۲

(۵) کلیات شبلی (اردو) ص ۳۴۔

(۶) ڈاکٹر سلام سندیلوی، ادبی اشارے، نسیم بکڈ پو لکھنو، اپریل ۱۹۶۹ء، ص ۲۵۵۔

☆☆☆

گل رعنا

دارالمصنفین نے جو ادبی کتابیں شائع کی ہیں ان میں مولانا سید عبدالحیٔ مرحوم کی کتاب ''گل رعنا'' بھی شامل ہے، مولانا مرحوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے ناظم اور کئی بلند پایہ عربی کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی ایک کتاب ''نزہۃ الخواطر'' جو آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے، آج بھی ایک حوالہ کی کتاب کے طور پر کام میں لائی جاتی ہے، گل رعنا کو سامنے رکھ کر ان کی علمی فضیلت کو جانچنا اور پرکھنا ہمارے نزدیک گمراہ کن ہے، اس کتاب کی شان نزول یہ ہے کہ پرانے زمانے کے ہر صاحب علم کی طرح مولانا عبدالحیٔ مرحوم کے پاس بھی ایک بیاض تھی جس میں وہ اپنے پسند کے اشعار لکھ لیا کرتے تھے، پھر وہ اپنے عملی اور علمی کاموں میں اس طرح محو ہوئے کہ اس بیاض کو فراموش کر بیٹھے، ایک مدت کے بعد ۱۳۴۰ھ میں وہ اس طرح علیل ہوئے کہ کوئی ایسا کام کرنے سے معذور ہو گئے جس سے دماغ پر زور پڑے، اسی زمانے میں ان کو اپنی پرانی بیاض مل گئی، انھوں نے جب دوبارہ اس کا مطالعہ کیا تو ان کو محسوس ہوا کہ اس میں اردو شعراء کے کلام کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، اگر اسی کلام کو سامنے رکھ کر شعراء کے بارے میں رائے زنی کر دی جائے اور کتاب کے شروع میں اردو زبان وادب کی تاریخ پر بھی چند صفحات لکھ دیے جائیں تو ایک خاصی ضخیم کتاب بن جائے گی، چنانچہ ان خطوط پر کام کرنا شروع کیا اور جو کچھ لکھ سکے اس کو ''گل رعنا'' کے نام سے دارالمصنفین سے شائع کروا دیا۔

مولانا عبدالحیٔ مرحوم نے اپنے مقدمہ میں کہیں بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ انھوں نے تنقید کی کوئی کتاب لکھی ہے یا شعراء کا کوئی تذکرہ مرتب کیا ہے، انھوں نے تو یہ لکھا ہے کہ ''بات میں بات نکلتی آئی اور وہ ایک خاصی کتاب بن گئی جس کا نام میں نے گل رعنا رکھ دیا۔''(۱)
ہمارے خیال میں اس کتاب کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کرنا چاہئے، افسوس ہے کہ ہمارے ناقدین نے مولانا عبدالحیٔ کے اس جملے کو فراموش کر دیا اور اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس طرح کی

رائیں رقم فرمائی ہیں۔

پروفیسر کلیم الدین احمد نے ''اردو تنقید پر ایک نظر'' میں ''گل رعنا'' پر محاکمہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

''''گل رعنا'' میں تنقیدی حصہ کالعدم ہے اور واقعہ نگاری اور انشاپردازی میں بھی یہ کتاب ''آب حیات'' کی گرد کو نہیں پہنچتی، پرانے تذکروں کی طرح واقعات نہایت سیدھے سادے، بے رنگ طریقے سے بیان کئے گئے ہیں، اس لئے ان میں دلچسپی کی کمی ہے، شخصیتیں بھی اس بے ڈھنگے طور پر مرتب ہوئی ہیں، سارے مجسمے سرد اور بے جان ہیں، مصنف ''گل رعنا'' میں ڈرامہ نگاری کی قوت نہ تھی اسی لئے وہ اپنی تصنیف کو دلچسپ نہیں بنا سکے۔ طرز ادا بھی بے رنگ ہے۔''(۲)

اس سلسلے کا ایک اقتباس اور ملاحظہ فرمایئے، لکھتے ہیں:

''گل رعنا'' نہ لکھی گئی ہوتی تو بہتر تھا، اس کتاب کی تنقیدی اور ادبی دنیا میں کوئی اہمیت نہیں، اس کتاب کے بدلے کہیں بہتر ہوتا اگر مصنف گل رعنا ''آب حیات'' پر ایک مفصل ریویو لکھتے اور اس ریویو میں تفصیل کے ساتھ آزاد کی غلطیوں کا انکشاف کرتے اور نئی معلومات کی روشنی میں ''آب حیات'' میں جو خامیاں رہ گئی ہیں ان کا ازالہ کر دیتے۔''(۳)

عبدالشکور مرحوم نے اپنی کتاب ''تنقیدی سرمایہ'' میں گل رعنا کا مطالعہ اس انداز سے کیا ہے:

''انھوں نے محض اپنی بیاض کو ترتیب دے کر ''گل رعنا'' تیار کی، اس سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اس کتاب کی تیاری کے لئے کوئی خاص اہتمام نہیں فرمایا، تنقید کے لئے جس تحقیق کی ضرورت ہے وہ عنقا ہے اور اسی لئے اردو شاعری کی ابتدا کے بیان میں حکیم صاحب نے درجنوں تاریخی غلطیاں کی ہیں، تالیف کا یہ حصہ نقائص سے بھرا پڑا ہے، اردو شاعری کی ابتدا ایک پیچیدہ اور دقت طلب موضوع ہے، اس کی صحیح تصویر حاصل کرنا نہایت دشوار ہے، تحقیقات سے جو امور واضح ہوئے ہیں اور واضح ہوتے رہے ہیں ان پر

غور وفکر کرنا اور غور وفکر کے بعد اپنے خیالات کی صحت کرتے رہنا بہت دشوار امر ہے، اس کے علاوہ گل رعنا میں جدید شاعری پر جو تنقید کی گئی ہے وہ ناقص اور ناکافی ہے، حکیم صاحب ان تحریکات سے نابلد تھے جن کے اثرات اردو شاعری پر پڑ رہے تھے اس لئے کتاب کا یہ حصہ بہت ناتواں رہا۔" (۴)

ایک قدرے غیر معروف ناقد پروفیسر عبدالقیوم حسرت نعمانی صاحب یوں رقم طراز ہیں:

"گل رعنا' اردو ادب کی ایک نامکمل تاریخ ہے جس میں اردو کی ابتدا اور ارتقا پر بحث کا ایک باب شامل ہے، اس کے باقی حصہ میں یا تو آب حیات پر نکتہ چینیاں ہیں یا اسی سے ماخوذ خیالات وروایات درج ہیں، مختصر یہ ہے کہ اعتراض ہو یا اخذ واقتباس، یہ کتاب آزاد سے استفاضہ ہے اور اس کا وجود آب حیات کا ممنون معلوم ہوتا ہے، گو "گل رعنا" ایک مقصد خاص سے لکھی گئی تھی، چنانچہ پوری کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تالیف کی غرض آب حیات کی خوردہ گیری وتنقیص تھی، حالانکہ ساری خامیوں کے باوجود بحیثیت تذکرہ اپنے نوع کی پہلی کتاب ہونے کے سبب آب حیات آج بھی اتنی اہمیت رکھتی ہے کہ اردو تاریخ وادب وشعر کے طلبا ومحققین اسی کو اپنی تحقیقی جدوجہد کے لئے مشعل راہ بناتے ہیں، الغرض گل رعنا کا تخریبی پہلو اتنا نمایاں ہے کہ تنقیدی حیثیت سے اسے کوئی اہمیت نہیں دی جاسکتی۔" (۵)

ڈاکٹر محمود الحسن رضوی نے اپنی کتاب "اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر" میں جہاں مولانا سید عبدالحیؒ مرحوم کا تذکرہ کیا ہے ان کو ندوی لکھا ہے، دنیا جانتی ہے کہ اپنے نام کے ساتھ ندوی وہ لوگ لکھتے ہیں جو ندوۃ العلما لکھنؤ کے فارغ التحصیل ہوتے ہیں، مولانا ندوہ کے ناظم ضرور تھے مگر اصطلاحاً "ندوی نہ تھے" علاوہ بریں انھوں نے مولانا عبدالحیؒ کو دبستان شبلی کا ایک فرد قرار دیا ہے جو درست نہیں ہے، مولانا عبدالحیؒ، علامہ شبلی کے معاصر ہیں ان کے شاگرد نہیں کہ ان کا شمار شبلی کے مقلدوں میں کیا جائے، بہرحال گل رعنا کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے:

"مولانا عبدالحیؒ کی ادبی تصنیف "گل رعنا" قدیم تذکروں سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے، اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مولانا محمد حسین آزاد کی "آب حیات" پر

اعتراضات اوراس کی خامیوں کو دور کرنے کی غرض سے لکھی گئی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا تنقیدی معیار آزاد سے آگے نہ بڑھ سکا، مصنف ''گل رعنا'' نے ''آب حیات کے مقابلہ میں ایک ایسی تاریخ لکھنی چاہی تھی جس کا بنیادی مقصد اس کتاب کے سرورق ہی پر دیا ہوا ہے کہ ''اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اس کی شاعری کا آغاز اور عہد بہ عہد کے باکمال اردو شعراء کے صحیح حالات اور ان کے منتخب اشعار اور ان کے ہر قسم کے کلام کے نمونے'' پیش کئے جائیں گے لیکن کتاب کا پورا خاکہ ''آب حیات'' ہی کا عکس معلوم ہوتا ہے اور تنقیدی عنصر اس معیار تک نہ پہنچ سکا جتنا آب حیات میں موجود تھا، اسی لئے یہ کتاب اردو شاعری کے تاریخی ارتقاء کی منازل کے مطالعہ کے لئے تو مفید ہو سکتی ہے لیکن تنقیدی معیار میں کسی نئی خصوصیت کا اضافہ نہیں ہوتا۔(۶)

ہم نے درج بالا سطور میں عصر حاضر کے ناقدین کی جو رائیں نقل کی ہیں ان کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ تقریباً سب ہی حضرات کے نزدیک یہ کتاب تنقید سے عاری ہے، ہمارے خیال میں اس بات کو کہنے کے لئے کسی کدو کاوش کی ضرورت نہ تھی، کیوں کہ اس کتاب کے مصنف نے کہیں اس بات کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ وہ کلیم الدین احمد صاحب یا عبدالشکور صاحب والی تنقید لکھ رہے ہیں، علاوہ بریں درج بالا چاروں ناقدوں نے اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ گل رعنا کی ترتیب آب حیات کی ترتیب سے ماخوذ ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا عبدالحئی مرحوم کی کتاب کا خاکہ آب حیات سے ماخوذ ہے غالباً اس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ آزاد کی درجہ بندی اردو زبان میں ایک نئی چیز تھی، اس لئے ان کے بعد کے لوگوں نے ان کی تحریر کردہ درجہ بندی کو اختیار کیا، اگر یہ جرم ہے تو تنہا مولانا عبدالحئی مرحوم ہی اس کے مرتکب نہیں ہوئے ہیں بلکہ ہماری بہت سی محترم ہستیاں بھی اسی جرم میں ماخوذ نظر آئیں گی، محمد حسین آزاد سے اپنا خاکہ مستعار لینے کے باوجود اس زمانے میں آزاد کی رائے سے انھوں نے جتنا اختلاف کیا ہے شاید ہی کسی اور نے کیا ہو، ان کی اسی روش کو عبدالقیوم حسرت نعمانی صاحب نے ''تخریبی'' قرار دیا ہے، اگر اختلاف آرا تخریب ہے تو ہم کو یہ مان لینا چاہئے کہ اردو کا بیشتر تنقیدی سرمایہ تخریب ہی کا حامل ہے۔

اب ہم اس کتاب کے بعض مندرجات کا جائزہ لے کر اس کی قدر و قیمت متعین کرنے کی

کوشش کرتے ہیں، اس کتاب کے مقدمہ میں اردو زبان اور اردو شاعری کی تاریخ لکھی گئی ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ علم لسانیات کی ترقی کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی پیدائش کے سلسلے میں بہت سے تاریک گوشے منور ہو گئے ہیں اور اس سلسلے میں مولانا عبدالحئی مرحوم نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا بڑا حصہ غلط ثابت ہو چکا ہے لیکن اس سلسلے میں ہم کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس تحریر کا جس زمانے سے تعلق ہے اس زمانے میں موجودہ علم لسانیات کا وجود نہ تھا، اسی لئے اس دور میں اردو زبان سے متعلق ایسی باتیں لکھی گئی ہیں جو اَب تحقیق کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں، اسی طرح مولانا موصوف نے اردو نثر کی بھی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے اور بعد ازاں اردو شاعری پر ایک عمومی تبصرہ بھی لکھا ہے، اس تبصرہ کو لکھتے وقت انھوں نے آب حیات کی پوری پیروی کی ہے اور شعراء کو اسی طرح طبقات میں تقسیم کیا ہے جس طرح محمد حسین آزاد نے آب حیات میں کیا ہے۔

البتہ مولانا سید عبدالحئی مرحوم نے شعراء کے کلام کا مطالعہ اس طرح کیا ہے کہ پہلے کسی قدیم تذکرہ نگار کی کوئی ایسی فارسی عبارت درج کر دی ہے جس میں اس کی شاعری کے بارے میں توصیفی کلمات لکھے گئے ہیں، پھر شاعر کے حالات زندگی لکھے ہیں، یہ حالات لکھتے وقت انھوں نے جگہ جگہ مولانا محمد حسین آزاد کے تسامحات کو واضح کیا ہے۔ حالات کو مرتب کرنے کے بعد انھوں نے اس شاعر کے کلام کا ایک انتخاب نقل کر دیا ہے، بیشتر شعراء کے بارے میں انھوں نے کسی تنقیدی رائے کا اظہار نہیں کیا ہے، صرف چند ہی مواقع ایسے آئے ہیں جہاں ان کے قلم سے تنقیدی کلمات نکل گئے ہیں، چونکہ ان کے ذہن میں صرف شعراء کے حالات اور انتخابات کلام کے جمع کرنے کا خاکہ تھا اس لئے ''گل رعنا'' کے صفحات تنقید سے عاری نظر آتے ہیں۔

اب ہم مولانا عبدالحئی کے تحریر کردہ چند شعراء کے حالات کا ایک سرسری جائزہ پیش کرتے ہیں تاکہ ان کے انداز تحریر کا اندازہ کیا جا سکے۔

میر تقی میر کے حالات قلم بند کرنے سے پہلے انھوں نے طبقات الشعراء اور مصحفی کے تذکرے سے میر کے بارے میں دو اقتباسات نقل کئے ہیں بعد ازاں ان کے حالات لکھے ہیں، یہ حالات اس کتاب کے تقریباً تیرہ صفحات میں آئے ہیں، ان تیرہ صفحات میں سے اگر حاشیے کے تقریباً چار صفحات نکال دیے جائیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے میر کے حالات زندگی نو صفحات

میں لکھے ہیں، ان صفحات کی صورت یہ ہے کہ شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جس میں مولانا موصوف نے محمد حسین آزاد کی رائے سے اختلاف نہ کیا ہو، میر کا خان آرزو سے اختلاف ان کی نازک مزاجی آصف الدولہ سے ان کے تعلقات کی کشیدگی، ان کا تکبر، غرض کہ مولانا آزاد نے میر کی جن جن باتوں کو ابھار کر ان کی تصویر کشی کی ہے ان سب سے مولانا عبدالحی مرحوم نے اختلاف کیا ہے اور اپنے انداز سے ان سب کا بطلان کرنے کی سعی کی ہے، مولوی محمد حسین آزاد کے صرف اس خیال سے اتفاق کیا ہے کہ میر قصیدہ کا مرد میدان نہیں، آزاد کی آراء سے اختلاف کرنے کے بعد انھوں نے میر کی جو تصویر کشی کی ہے وہ ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے:

''نکات الشعراء کی مدد سے نیز تذکرہ نویسوں کی تحریر سے میر صاحب کے جو اوصاف ہمیں نظر آتے ہیں وہ یہ ہیں کہ وہ نہایت مہذب، زندہ دل، یار باش، انصاف پسند اور وضع دار آدمی تھے، میانہ قد، لاغر اندام، گندمی رنگ، ہر کام متانت اور آہستگی کے ساتھ کرتے، بات بہت کم کرتے اور وہ بھی آہستہ آواز میں، نرمی اور ملائمت، مزاج میں قناعت اور غیرت حد سے بڑھی ہوئی، صلاحیت و بر سرکاری کے ساتھ عادات و اطوار نہایت سنجیدہ و متین، ہر وقت محویت کا عالم طاری، اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے بیٹھے رہتے۔

(۷)

میر کی جس بد دماغی، عزلت اور گوشہ نشینی کو آزاد نے عیب بنا کر پیش کیا ہے، اس کو مولانا سید عبدالحی مرحوم ان الفاظ میں ہنر بتاتے ہیں:

''دیکھنے کی بات ہے کہ جب اسی شخص پر مصیبت پڑتی ہے تو یاران صحبت میں سے ایک ایک کر کے پیوند زمین اور کوئی آوارۂ دشت غربت ہو جاتا ہے، اور مرہٹوں کے دست برد سے ایک عالم آشوب ہنگامہ برپا ہوتا ہے، جس سے شہر میں خاک اڑنے لگتی ہے، اس وقت اس کے پائے ثبات کو بھی لغزش ہوتی ہے، وہ ایسے شہر میں وارد ہوتا ہے، جہاں نئے انداز، نئی تراشیں، بانکے ٹیڑھے جوانوں کو دیکھتا ہے، ان کے مشغلوں کو دیکھتا ہے، ان کے جذبات و خیالات کو جانچتا ہے، ان کی طبیعتوں کی شوخی، زبانوں کی طراری، تراشوں اور ایجادوں کے انوکھے پن سے سابقہ پڑتا ہے، پھر تم ہی کہو کہ اس بے چارے بڈھے

پراتم پرانی لکیر کے فقیر کے دل پر کیا گذرتی ہوگی، اس سے یہ شبہ نہ ہوسکتا ہوگا کہ وہ جرأت اور انشا کی شوخیوں اور مرزا سعادت یار خاں کی جدت پسند طبیعت کی رنگینیوں کو سن کر داد سخن دے اور قہقہوں کی آواز میں خود بھی آواز ملائے، اسی کو بد دماغی کہہ لو یا نازک مزاجی، جس سے خود میر صاحب بھی واقف تھے۔" (۸)

مندرجہ بالا اقتباسات سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا عبدالحئی مرحوم نے میر کے حالات کس انداز سے مرتب کیے ہیں۔

غالب کے حالات مرتب کرتے وقت انھوں نے غالباً حالی کی "یادگارِ غالب" کو سامنے رکھا ہے اور غالب کے بارے میں جو کچھ تحریر کیا ہے حسن اتفاق سے اس میں ایک جگہ بھی محمد حسین آزاد کا نام نہیں آیا ہے، نہ جانے کس طرح عبدالحئی مرحوم نے ملا عبدالصمد کو حقیقی اور واقعی شخصیت تصور کرلیا، غالب کے زمانے کے لوگ ان کو بے استادا کہا کرتے تھے، غالب نے اپنی خفت مٹانے کے لئے یہ فرضی شخصیت اختراع کرلی تھی، تعجب ہے کہ مولانا، غالب کے مزاج کو سمجھ نہ پائے اور انھوں نے اس کو ایک حقیقی شخصیت قرار دیدیا، مولانا نے غالب کی شاعری کی جو خصوصیات بتائی ہیں ان میں سے دو اہم خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱- ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عام اور مبتذل تشبیہیں جو عموماً شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہیں، ان سے جہاں تک ہوسکتا ہے بچتے ہیں، اور نئی نئی تشبیہیں پیدا کرتے ہیں، مثلاً سانس کو موج سے، بے خودی کو دریا سے، گرداب کو شعلۂ جوالہ سے، مغز سر کو پنبۂ بالش سے، دانۂ انگور کو عقد وصال سے، استخوان کو خشت سے، بدن کو قالب خشت سے، اور اسی قسم کی بہت سی تشبیہیں ان کے ابتدائی ریختہ میں موجود ہیں۔"

۲- ایک خصوصیت مرزا کی یہ ہے کہ ان کے طرز ادا میں ایک خاص چیز ہے، جو (مومن کے سوا) اوروں کے یہاں بہت کم دیکھی جاتی ہے، ان کا کلام ایسا پہلودار ہوتا ہے کہ بادی النظر میں ان کے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں، مگر غور کرنے کے بعد دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کا شعر ہمیشہ ایک نیا لطف دیتا ہے۔" (۹)

ان خصوصیات کو تحریر کرنے کے بعد انھوں نے غالب کی دیگر تصانیف کے بارے میں

اطلاعات فراہم کی ہیں اور سب کتابوں کا نام گنوا کر ان کے موضوعات کو واضح کیا ہے، جس میں کوئی نئی بات نہیں کہی گئی ہے۔

مولانا حالی کے حالات زندگی مرتب کرنے سے پہلے مولانا مرحوم نے "طور کلیم" کا ایک چھوٹا سا فارسی اقتباس نقل کیا ہے، ان صفحات کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عبدالحئی مرحوم نے ان تمام تحریروں کا غائر نظروں سے مطالعہ کیا ہے جو خود حالی نے اپنے بارے میں وقتاً فوقتاً لکھی تھیں، علاوہ بریں یادگار غالب میں حالی نے ضمنی طور پر اپنے بارے میں جو معلومات درج کردی ہیں ان سے بھی انھوں نے بھرپور استفادہ کیا ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کی اس تحریر میں حالی کی زندگی کے بارے میں کوئی نیا مواد نہیں ملتا، جہاں تک حالی کی نثر نگاری اور شاعری کا تعلق ہے مولانا نے اس پر کوئی تبصرہ کرنے سے گریز کیا ہے، مقدمہ شعر وشاعری کے بارے میں البتہ اتنا لکھا ہے کہ دیکھنے کے قابل ہے۔ حالی کی نثری تصانیف میں صرف حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید کا ذکر کیا گیا ہے، بقیہ کتابوں کے نام تک نہیں لکھے گئے ہیں، درج بالا سطور میں ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس سے واضح ہو گیا ہوگا کہ مولانا عبدالحئی مرحوم کا انداز تحریر کیا ہے، اب ہم پھر اپنے پہلے سوال کی طرف آتے ہیں کہ عصر حاضر میں اس کتاب کی معنویت کیا ہے؟ ہمارے نزدیک اس کتاب کی دو ایسی خصوصیات ہیں جو آج بھی معنویت کی حامل ہیں اور گل رعنا کو ایک وقیع علمی کتاب بناتی ہیں، پہلی خصوصیت تو اس کے وہ فٹ نوٹس ہیں جو مولانا عبدالحئی نے جگہ جگہ لکھے ہیں، ان فٹ نوٹس میں سے بیشتر ایسے ہیں جن کو صرف ایک مورخ ہی لکھ سکتا ہے، علاوہ بریں ان فٹ نوٹس میں بعض ایسے افراد کے بھی حال لکھ دیے گئے ہیں جن کے بارے میں ہماری معلومات بہت ہی کم ہیں، اس کتاب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شعراء کا جو انتخاب کلام درج کیا گیا ہے وہ اعلیٰ درجہ کا ہے، مولانا عبدالحئی مرحوم نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ شعراء کے نمائندہ اشعار نقل کر کے ان ہی کی روشنی میں ان کی شاعری پر رائے زنی کریں۔

☆☆☆

حواشی:

(۱) مولانا حکیم سید عبدالحئی، دیباچہ گل رعنا، ص ۳۔

(۲) پروفیسر کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر، دائرۂ ادب، پٹنہ، ۱۹۸۳ء ص ۶۷۔

(۳) پروفیسر کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر، ص ۶۸۔

(۴) عبدالشکور، تنقیدی سرمایہ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔ ص ۱۱۲۔

(۵) اردو تنقید نگاری مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، مضمون پروفیسر عبدالقیوم حسرت نعمانی، چمن بک ڈپو، اردو بازار، دہلی ص ۱۷۹، ۱۸۰۔

(۶) ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی، اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر، ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۶۸ء، ص ۳۰۶، ۳۰۷۔

(۷) حکیم سید عبدالحئی ''گل رعنا'' دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ ۱۳۷۰ھ ص ۱۶۳۔

(۸) حکیم مولانا سید عبدالحئی ''گل رعنا'' ص ۱۶۴، ۱۶۵۔

(۹) حکیم مولانا سید عبدالحئی ''گل رعنا'' ص ۳۱۸۔

☆☆☆

نقوش سلیمانی

سید سلیمان ندوی، علامہ شبلی کے ان شاگردوں میں ہیں جنھوں نے شبلی کے ادھورے کاموں کی نہ صرف تکمیل کی بلکہ اپنی ساری زندگی ان موضوعات پر تحقیق کرنے میں گزار دی جو شبلی کے محبوب موضوعات تھے، غالباً یہی وجہ ہے کہ سید صاحب نے ادبیات کے موضوع پر نسبتاً کم ہی تحریریں اپنی یادگار چھوڑی ہیں، اس سلسلے کی مستقل تصنیف تو "خیام" ہے جو دارالمصنفین سے شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکی ہے اور اس کا فارسی زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے، لیکن چونکہ ہم دارالمصنفین کی ان خدمات پر مقالہ تحریر کر رہے ہیں جن کا تعلق اردو ادب سے ہے اس لئے اس کتاب سے صرف نظر کرتے ہوئے سید صاحب کے اس مجموعۂ مقالات کا ایک جائزہ پیش کر رہے ہیں جو "نقوشِ سلیمانی" کے نام سے شائع ہوا ہے، ہمارے سامنے اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے جس کو ۱۹۸۰ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ نے شائع کیا ہے، ۴۷۶ صفحات کی یہ کتاب سید صاحب کے پانچ خطبات، پندرہ مقالات اور نو مقدمات پر مشتمل ہے۔

سید صاحب کی تحریروں کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو پہلے اس پر پوری تحقیق کر لیتے ہیں اور پھر اسی تحقیق کی روشنی میں نتائج اخذ کرتے ہیں، یہ تو ممکن ہے کہ ہم سید صاحب کے کسی خیال سے اتفاق نہ کریں یہ بھی ممکن ہے کہ بربنائے بشریت موضوعِ زیر بحث کے کسی اہم ماخذ پر ان کی نظر نہ پڑے لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم سید صاحب کی کوئی تحریر پڑھ کر یہ شکوہ کر سکیں کہ اس تحریر میں انھوں نے سہل انگاری سے کام لیا ہے، نقوش سلیمانی کا ہر مقالہ ہمارے اس خیال کی تائید وتوثیق کے لئے کافی ہے۔

نقوش سلیمانی پر کوئی محاکمہ کرتے وقت ہم کو یہ بات مد نظر رکھنی چاہئے کہ مقالۂ زیر بحث کس سنہ میں لکھا گیا ہے، اگر اس بات کو ذہن سے محو کر دیا جائے تو صحیح نتائج تک پہنچنا دشوار ہو جائے گا

اور پھر سید صاحب کے ساتھ ساتھ خود میرے اخذ کردہ نتائج کے ساتھ بھی انصاف نہ ہوگا، اس لئے ہم درج ذیل سطور میں سید صاحب کی تحریروں کا جائزہ لیتے ہوئے اس امر کو خاص طور سے ملحوظ رکھیں گے کہ یہ تحریریں کس زمانے کی یادگار ہیں۔

نقوش سلیمانی کا پہلا خطبہ دسمبر ۱۹۱۵ء میں لکھا گیا تھا، اس خطبہ کو لکھے ہوئے ترانوے برس کا عرصہ گزر چکا ہے مگر اس کے باوجود اس خطبہ میں سید صاحب نے جو معلومات فراہم کی ہیں وہ ''باسی'' نہیں ہوئی ہیں، خطبہ کا موضوع ''اردو زبان کی علمی پیدائش'' ہے، موضوع کی مناسبت سے اردو زبان کی پیدائش پر بھی ایک سرسری سی نظر ڈالنی ضروری تھی، لیکن چونکہ سید صاحب اس موضوع پر کوئی بھرپور کتاب نہیں لکھ رہے تھے اس لئے انھوں نے اس کی طرف چند اشارے کر کے یہ یاد دلایا ہے کہ ظہور اسلام کے بعد جب عرب فاتحوں کے قدم دنیا کے چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ پر پڑنے لگے تو جہاں مفتوحہ اقوام کا تمدن متاثر ہوا وہیں ان کی زبان بھی عربوں کی زبان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی، اس سلسلے میں عربوں کی طرف سے کوئی جبر یا زیادتی نہیں کی گئی بلکہ مفتوحہ قوموں نے خود عربی زبان کے آگے سپر ڈال دی، بعض بعض قوموں نے اپنی قدیم زبان کو چھوڑ کر عربی زبان کو اپنی مادری زبان بنالیا، جیسے شامیوں، مصریوں، اندلسیوں اور بربروں نے اپنی اپنی زبان کو خیر باد کہہ کر عربی زبان کو اپنالیا، بعض قومیں اپنی زبان سے کلی طور پر دستبردار تو نہ ہوئیں مگر انھوں نے عربی کے ذخیرۂ الفاظ سے اپنی زبان میں اتنے الفاظ شامل کر لئے اور عربی رسم الخط اختیار کرلیا کہ وہ زبان اپنی پیشرو زبان سے بالکل الگ معلوم ہونے لگی، جیسے پہلوی زبان کی جگہ فارسی نے لے لی، اگرچہ فارسی کی بیشتر قواعد پہلوی قواعد ہی کا عکس ہے، مگر پہلوی زبان میں اتنے عربی الفاظ داخل کر لئے گئے کہ یہ زبان بالکل ایک نئی زبان بن کر ابھری اور اصل زبان سے مختلف ہوگئی، اس ترتیب مقدمہ کے بعد سید صاحب نے ہندوستان کی تاریخ کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے اس ملک میں عربوں کی آمد اور ان کی آمد کی وجہ سے ایک نئی زبان کے عالم وجود میں آنے کی طرف اشارے کئے ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ دکھلایا ہے کہ اردو کس طرح سارے ہندوستان کی مشترکہ زبان بنی اور اس کی سب سے زیادہ ضرورت دکن میں کیوں محسوس کی گئی؟ اس سلسلے میں سید صاحب کے اصل الفاظ یہ ہیں:

''شمالی ہندوستان اگر ہندوستان میں نئی آنے والی قوموں کا شارع عام رہا ہے تو

جنوبی ہندوستان یا دکن بعد کو آنے والی قوموں کے لئے شکست کھا کر مجتمع ہونے کے لئے ملجا رہا ہے، نئی حملہ آور قوم نے اگر شمالی ہندوستان سے اپنی پیش رو قوم کو ڈھکیلا ہے تو دکن ہی کی پہاڑیاں اس کے لئے جائے پناہ بنی ہیں، یہی سبب ہے کہ آج جنوبی ہندوستان قدیم سے قدیم قوموں سے لے کر آخری دور جدید کی قوموں تک کا تماشا خانہ اور جلوہ گاہ ہے، شمالی ہندوستان میں پشاور سے مرشد آباد اور ڈھاکہ تک اردو زبان کی عملداری ہے، گو بیچ بیچ میں پشتو، پنجابی اور بنگالی بھی آڑے آجاتی ہیں، لیکن یہاں بمبئی اور مدراس کے احاطوں میں ہر سو میل ایک مستقل زبان کی حکومت کا رقبہ ہے، گجراتی، مرہٹی، کنڑی، تامل، تلنگو، اڑوی خدا جانے کتنی زبانیں ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ یہی سبب ہے کہ اردو کی مشترک زبان کی ضرورت سب سے پہلے دکن میں محسوس ہوئی اور ولی دکنی اور سراج دکنی وغیرہ اردو کے شاعر یہاں سب سے پہلے پیدا ہوئے۔"(۱)

اس خطبہ کا بہت ہی اہم حصہ وہ ہے جس میں سید صاحب نے اردو کے سرمایہ پر نظر ڈالتے ہوئے یہ دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اب تک اردو والے کیا کیا کام کر چکے ہیں اور ابھی وہ کون کون سے کام ہیں جو کرنے باقی ہیں، سید صاحب کے نزدیک کسی زبان کے سرمایے کی قدر و قیمت متعین کرتے وقت یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اس زبان میں "اصولِ لغت" کی تدوین کا کام مکمل ہو چکا ہے یا ابھی اس موضوع پر مزید کام کرنے کی ضرورت باقی ہے، پھر یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس زبان کی علمی تصانیف کس پائے کی ہیں، علاوہ بریں کسی زبان کی قدر و قیمت متعین کرتے وقت اس بات پر بھی نظر رکھنی ہوتی ہے کہ اس زبان میں دوسری زبانوں کی کتابوں کے کتنے اور کس قدر و قیمت کے حامل ترجمے ہوئے ہیں، انھیں تین باتوں کا محاکمہ کر کے ہم کسی زبان کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس زبان کا سرمایہ کس قدر و قیمت کا حامل ہے، سید صاحب نے تینوں عنوانات کے تحت اردو زبان میں جو وقیع کام ہوئے ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے یہ احساس دلایا ہے کہ جو کام بھی ان موضوعات پر اب تک ہوا ہے وہ کافی نہیں ہے، ہمارے بزرگوں نے کام کی داغ بیل تو ڈال دی تھی مگر افسوس ہے کہ ہم اس کو اچھی طرح پروان نہیں چڑھا رہے ہیں۔

خطبۂ صدارت میں وقت بھی محدود ہوتا ہے اور صفحات بھی، اس لئے سید صاحب نے

اپنے اس خطبہ میں ایجاز سے کام لیا ہے ورنہ وہ اس موضوع پر ایک بھرپور اور مدلل کتاب لکھ سکتے تھے، بہر حال صرف اس ایک خطبہ سے نہیں بلکہ ان کے تمام خطبات سے ان کی جلالت علمی ٹپکی پڑتی ہے، خواہ وہ ''ہندوستان میں ہندوستانی'' کے عنوان سے خطبۂ صدارت لکھ رہے ہوں خواہ ''ہماری زبان بیسویں صدی میں'' کے عنوان سے، جب تک وہ اپنے موضوع کے بارے میں پوری تحقیق نہیں کر لیتے کوئی بات نہیں لکھتے۔

نقوش سلیمانی میں سید صاحب کے جو مقالات ہیں ان میں بھی اگرچہ کہیں کہیں تحقیق کی شان جلوہ گر ہے مگر دراصل یہ وہ تنقیدی یا علمی مقالات ہیں جو سید صاحب نے وقتاً فوقتاً معارف میں لکھے تھے، ان میں سے دو مقالات ''اکبر کا ظریفانہ کلام'' اور ''ہاشم علی کا مجموعۂ مراثی'' تنقیدی مقالات کے ضمن میں آتے ہیں، اکبر کے ظریفانہ کلام پر جو مقالہ اس کتاب میں شامل ہے وہ ۱۹۱۶ء میں لکھا گیا تھا، اس مقالے کو عصر حاضر کی تنقیدی روش کی روشنی میں دیکھنا ادبی دیانت داری کے خلاف ہوگا، اس مقالہ میں سید صاحب نے ''رعایت لفظی یا ضلع جگت''، ''جدت قافیہ'' ''مخاطب کے دعوے کی تشریح''، ''قدیم شعرا کے خیالات کو دوسرے پیرایہ میں ادا کرنا'' اور ''جدید محاورات'' کے ذیلی عنوانات قائم کر کے اکبر کے کلام کا جائزہ لیا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے جو ذیلی عنوانات قائم کیے ہیں انھیں کی مناسبت سے اکبر کے بہترین مزاحیہ وطنزیہ اشعار کو چن کر اپنی بات کی وضاحت کی ہے، لیکن یہ مقالہ صرف تحسین ہی تحسین ہے س میں اکبر کے کلام کی فرو گزاشتوں پر کوئی اچٹتی سی بھی نظر نہیں ڈالی گئی ہے، مثال کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

> ''میر صاحب (اکبر الہ آبادی) کا اعلیٰ مذاق اور ان کی شاعری کا موضوع عام، پر معنی اور سنجیدہ ظرافت ہے، ان کو مذہب، فلسفہ، سیاست، قومیات جس موضوع پر بھی جو کچھ کہنا ہوتا ہے اس کا مغز سخن خواہ جو کچھ ہو لیکن اس کا قشر بالائی صرف سنجیدہ ظرافت ہوتی ہے، ظرافت کا رنگ جو سید انشا اور سعادت علی خاں کی بدولت لکھنؤ کی شاعری میں پیدا ہو گیا تھا، اس کا مقصد صرف تفریح طبع اور دل بہلانا تھا، ضلع جگت اور رعایت لفظی لکھنؤ کا خاص مذاق ہے، اس کا مقصد بھی محض تفنن طبع تھا اور لکھنؤ میں امانت اس اقلیم کا بادشاہ ہوا ہے، جان صاحب کا ظریفانہ رنگ گو زنانہ لہجہ میں آ کر بدنما ہو گیا تھا، تاہم اس کی بنیاد

بھی محض تفریح طبع پر تھی، میر صاحب کا احسان یہ ہے کہ انھوں نے سعدی ابن یمین اور خیام کے مغز سخن کو امانت کے الفاظ میں اور سید انشا کی بولی میں اس طرح ادا کیا کہ وہ نہ صرف تفریح طبع اور واہ واہ کا سامان رہا، بلکہ اس کی تہ میں پند و موعظت، اخلاقی تعلیم، سیاسی نکتے. فلسفیانہ اسرار، مذہبی مسائل، اجتماعی مباحث بھی نظر آنے لگے، سید انشا کے زمانہ کی سرکاری زبان فارسی اور ترکی تھی، وہ اسی شیرہ اور قوام سے اپنا شربت تیار کرتے تھے، اب انگریزی سرکاری زبان ہے، میر صاحب اس بادۂ افرنگی کی آمیزش سے ذوق کلام کو لطف دیتے ہیں۔" (۲)

جس زمانہ میں یہ مقالہ لکھا گیا تھا اس زمانے کی تنقید کا یہی انداز تھا کہ شاعر کے کلام کے محاسن کا تو بھرپور جائزہ لیا جائے مگر اس کے معائب سے صرف نظر کیا جائے، سید صاحب نے بھی اپنے زمانے کی روش تنقید کو برقرار رکھتے ہوئے صرف محاسن کلام اکبر ہی سے سروکار رکھا ہے۔

یہ ایک عجیب اور دلچسپ اتفاق ہے کہ اس مقالے کی اشاعت کے بعد شبلی کے ایک دوسرے برگزیدہ شاگرد مولانا عبدالسلام ندوی نے بھی اکبر کی شاعری پر ایک مقالہ "اکبر کا سنجیدہ کلام" کے عنوان سے معارف میں لکھا تھا (۳) اور مثالوں کے ذریعے اس بات کو واضح کیا تھا کہ اکبر کا کلام صرف ٹھٹھول ہی نہیں بلکہ "حکمت" بھی ہے، مولانا عبدالسلام ندوی نے بھی سید صاحب ہی کی طرح ذیلی عنوانات قائم کر کے اپنی بات کو اشعار اکبر کے ذریعے مدلل بنایا ہے، بہر حال سید صاحب نے اکبر کی ظریفانہ شاعری پر جو مواد اکٹھا کیا ہے وہ خاصے کی چیز ہے اور جس زمانے میں یہ مقالہ لکھا گیا تھا اگر اس زمانے کو نظر میں رکھا جائے تو یہ مقالہ ہم کو قدر اول کا حامل نظر آئے گا۔

ہاشم علی کا مجموعۂ مراثی کے عنوان سے نقوش سلیمانی میں جو مقالہ شریک اشاعت ہے وہ تنقیدی کم، تحقیقی اور تعارفی زیادہ ہے، یہ مقالہ اپریل ۱۹۳۱ء میں لکھا گیا تھا جو جولائی ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا تھا اس مقالہ میں سید صاحب نے ہاشم علی کے مراثی کا جس انداز سے تعارف کرایا ہے وہ اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے نئی نئی راہیں کھولتا ہے، انھوں نے ہاشم علی کے کلام سے بحث کرتے ہوئے اس زمانے کی لفظیات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ان کے معنی بھی متعین کیے ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے ہاشم علی کی زبان کے خصائص سے بھی بحث کی ہے اور اس بات کو

متعین کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس زمانے کے قواعد اور آج کے قواعد میں کتنا اور کس قسم کا فرق تھا، پھر انھوں نے ہاشم علی کے اشعار کے اس کثرت سے نمونے دیئے ہیں جن کو پڑھ کر ہاشم کے رنگ سخن سے قاری واقف ہو جاتا ہے، مقالات کے عنوان سے سید صاحب کے جتنے مقالے اس کتاب میں شامل ہیں وہ ان کی دیدہ ریزی، اصابتِ رائے اور تحقیقی اندازِ نظر پر بڑی اچھی روشنی ڈالتے ہیں۔

نقوشِ سلیمانی کا تیسرا حصہ ان ''مقدمات'' پر مشتمل ہے جو سید صاحب نے اردو زبان کی نو مشہور اور اہم کتابوں پر لکھے ہیں، مقدمہ نہ تو خالص تحقیق ہوتا ہے اور نہ ہی خالص تنقید، ''مقدمہ'' کا اصل کام یہ ہے کہ مصنف اپنی کتاب میں جو کچھ اظہار خیال کرے مقدمہ نگار اس کو اپنی تحریر میں ایک ایسے نئے ڈھنگ سے ابھار کر پیش کرے کہ قاری پوری توجہ سے مصنف کی تحریر پڑھنے پر آمادہ ہو جائے، بعض بعض اوقات مقدمہ نگار کو مصنف سے اختلاف بھی کرنا ہوتا ہے مگر یہ اختلاف مقدمہ نگار اس چابکدستی سے کرتا ہے کہ قاری کتاب ہاتھ سے نہیں رکھتا، بلکہ مصنف کی تحریر جلد از جلد پڑھ کر رائے قائم کرنے کے لئے بے تاب ہو جاتا ہے کہ مقدمہ نگار نے جو کچھ لکھا ہے وہ کس حد تک درست ہے؟

سید صاحب نے جو مقدمے لکھے ہیں ان میں انھوں نے مصنف سے کوئی اختلاف نہیں کیا ہے بلکہ مصنف کے افکار وخیالات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری اس کتاب کو پڑھنے کے لئے بے قرار ہو جائے، چاہے وہ مکاتیب شبلی پر لکھ رہے ہوں یا مکاتیب مہدی پر، یا گلستان امجد پر لکھ رہے ہوں یا کلام شاد پر، یا کلیات عشق پر لکھ رہے ہوں یا شعلۂ طور پر، یا خمستان پر لکھ رہے ہوں یا مسدس حالی پر، ایک مقدمہ نگار کی حیثیت سے وہ ادیب وشاعر کے محاسن ہی پر نظر ڈالتے ہیں اس کے معائب سے یکسر صرف نظر کر جاتے ہیں، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مقدمہ، اصل متن کی توضیح و تشریح سمجھا جاتا ہے تنقیدی مطالعہ نہیں۔ بہر حال سید صاحب کے مقدمات میں ایک دلکشی ضرور ہے جو قاری کو اپنی طرف راغب کر لیتی ہے، ہمارے خیال کی توثیق سید صاحب کے درج ذیل اقتباس سے ہو جائے گی۔

''مہدی مرحوم کے خطوط پر نقد اور تبصرہ کرنا اور ان کی خوبیوں کو ایک ایک کر کے

دکھانا ایسا ہی ہے جیسے کسی خوش رنگ اور خوشبو پھول کی ایک ایک پنکھڑی کو توڑ کر کوئی ستمگار قدرت کی صناعی کی داد دے، وہ پھول ہیں پھول، پھولوں کی قدر یہی ہے کہ آپ ان سے لطف اٹھائیں اور بس جہاں آپ نے ان کی طرف ہاتھ بڑھائے وہ مرجھانے لگے اور نازک پتیاں آپ کی انگلیوں کی سختی سے جھڑنے لگیں، بہتر سے بہتر صورت نزاکت ولطافت کی ان تصویروں کے لئے یہی ہے کہ دور ہی سے ان کی خوشنمائی، خوش رنگی، خوش قامتی اور خوشبوئی کی تعریفیں کی جائیں، اور ان سے خود لطف اٹھائے اور دوسروں کو لطف اٹھانے دے۔'' (۴)

اسی طرح اثر صہبائی کے مجموعۂ کلام ''خمستان'' پر مقدمہ تحریر کرتے ہوئے سید صاحب نے اثر صہبائی کے شاعرانہ امتیاز کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''صہبائی کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے غزلیں، قطعات، رباعیات، مثنویاں سب کچھ کہی ہیں اور صرف غزل گوئی کے تنگ کوچہ میں مقید نہیں، تاہم ہر شخص ہر صنف کلام کلام پر یکساں قادر نہیں، الا ماشاءاللہ، جیسے فارسی میں سعدی اور اردو میں سودا، حالی اور ظفر علی خاں، میرے خیال میں صہبائی کی فطری شاعرانہ استعداد کا اصل جلوہ گاہ ان کی رباعیات ہیں، اور ان کو اسی حیثیت سے شاعروں کی صف میں ممتاز جگہ دی جاسکتی ہے، رباعی گوئی کے لئے ضرورت ہے کہ زبان صاف اور شیریں ہو، ترکیبیں چست اور رواں ہوں اور پہلے مصرعہ سے بتدریج ترقی کر کے چوتھے مصرعہ میں پورا زور نمایاں ہو جائے، یہ تو لفظی خوبیاں ہیں۔ معنوی خوبی یہ ہے کہ اس میں بلند حقائق اور معانی ادا ہوں، صہبائی کی رباعیات میں یہ خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔'' (۵)

ان مقدمات کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ سید صاحب کو جہاں جہاں بھی موقع ملتا ہے وہ اپنی محققانہ شان ضرور دکھا جاتے ہیں، حالانکہ مقدمہ تحقیقی تحریر کا نام نہیں ہے، تاہم وہ اپنی تحقیق سے قاری کو بہت سی نئی نئی معلومات فراہم کر دیتے ہیں، مثلاً کلیات عشق پر مقدمہ لکھتے ہوئے شیخ بڈھ کے بارے میں سید صاحب نے جو معلومات فراہم کی ہیں وہ کوئی دوسرا مقدمہ نگار فراہم نہیں کرتا، صرف شیخ بڈھ ہی نہیں بلکہ دوسرے دوسرے افراد کے بارے میں بھی سید صاحب نے

معلومات کا ایک انبار جمع کر دیا ہے، اس کے برعکس شعلۂ طور پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل ہی دوسرے انداز کا حامل ہے، سید صاحب کی یہ تحریر کسی حد تک ان کے جذباتی طرز نگارش کی غمازی کرتی ہے مگر اس جذباتی تموج کے باوجود وہ ایک بڑے کام کی بات لکھ گئے ہیں، ان کے نزدیک اگر شاعر کے خیال میں نیرنگی نہ ہو مگر انداز بیان میں نیرنگی ہو تب بھی شاعر صدیوں زندہ رہنے والے شعری نمونے پیش کر سکتا ہے، انھوں نے اس کی مثال حافظ اور خیام کی شاعری سے دی ہے اور بتلایا ہے کہ ان شعراء کے انداز بیان کی نیرنگی نے ان کے کلام کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے، سید صاحب اس مثال کے ذریعے جگر کی شاعری کو خراج تحسین پیش کرنا چاہتے ہیں اور یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگرچہ جگر کے خیالات میں نیرنگی نہیں ہے مگر ان کے انداز بیان میں نیرنگی ہے جس کی وجہ سے ان کا ہر ہر شعر کیف وسرور کا حامل نظر آتا ہے۔

نقوش سلیمانی سید صاحب کی وقیع تحریروں کا مجموعہ ہے اس کا مطالعہ اس ماحول کو ذہن میں رکھتے ہوئے کرنا چاہئے جس میں اس کتاب میں شامل مقالات لکھے گئے تھے، اگر ہم اس عہد اور ماحول کو اپنے ذہن میں نہ رکھیں گے تو اس کتاب کی اہمیت اور معنویت ہم پر واضح نہ ہو سکے گی، وقت اور زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ممکن ہے کہ سید صاحب کے پیش کردہ بہت سے نظریات، نظرثانی کے محتاج معلوم ہوں مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ یہ تحریریں بڑی کدوکاوش کے بعد عالم وجود میں آئی ہیں۔

☆☆☆

حواشی:

(۱) مولانا سید سلیمان ندوی، نقوش سلیمانی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۸۰ء ص ۸، ۷۔

(۲) مولانا سید سلیمان ندوی، نقوش سلیمانی، ص ۱۶۵، ۱۶۴۔

(۳) جون، جولائی معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۱۷ء۔

(۴) مولانا سید سلیمان ندوی، نقوش سلیمانی، ص ۳۷۹، ۳۷۸۔

(۵) مولانا سید سلیمان ندوی، نقوش سلیمانی، ص ۴۳۸، ۴۳۷۔

حیات شبلی

اردو میں سوانح نگاری کی تاریخ بہت پرانی نہیں ہے، اس زبان میں باقاعدہ سوانح ''سیرتِ فریدیہ'' سرسید کے قلم کی مرہون منت ہے، سرسید کے بعد حالی اور شبلی نے اس فن کو آگے بڑھایا، حالی نے ''حیات سعدی'' ''یادگار غالب'' اور ''حیات جاوید'' لکھ کر سوانح نگاری کو باقاعدہ ایک فن بنایا، شبلی نے بھی ان کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے سوانح مولانا رومؒ، المامون، الغزالی اور الفاروق لکھیں جو اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی لکھ کر اپنے استاذ کی روایت کو زندہ رکھا۔

بعض حضرات شبلی کی زندگی ہی میں ان کی سوانح لکھنا چاہتے تھے، جن میں سید افتخار عالم صاحب، صاحبِ حیات النذیر کا نام سرفہرست ہے، مگر علامہ شبلی کو بعض وجوہ سے یہ گوارا نہ تھا کہ افتخار عالم صاحب ان کی سوانح لکھیں، علامہ شبلی ان کو ٹالتے رہے پھر انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی سے درخواست کی کہ وہ اس سلسلے میں ان کی سفارش کریں، سید صاحب نے جب علامہ شبلی کو اس کی اطلاع دی تو انھوں نے فروری ۱۹۱۴ء کے اپنے خط میں سید صاحب کو لکھا کہ ''افتخار عالم صاحب میری لائف کیا لکھیں گے، کبھی تم دنیا کے کاموں سے فارغ ہونا تو تم ہی لکھنا(۱)'' اس تحریر کے چند ہی ماہ بعد یعنی نومبر ۱۹۱۴ء میں شبلی کا انتقال ہوگیا، دارالمصنفین کے قیام کے بعد جہاں اور کاموں کی تکمیل کا خاکہ بنایا گیا وہیں حیات شبلی کی ترتیب وتکمیل بھی پیش نظر رہی اور اس پر کام شروع کیا گیا، یہ کام ۱۹۴۳ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا، یہ کتاب تیاری کے جن جن مراحل سے گذری اس کے بارے میں سید صاحب لکھتے ہیں:

''خاکسار نے سیرت کی مصروفیات اور خاندانی اور ابتدائی حالات کے عدم واقفیت

کے سبب اس کام کو پہلے اپنے رفیق وشریک کار مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کے سپرد کیا کہ وہ مولانا سے برادری اور ہم وطنی کا تعلق رکھتے ہیں، اس لئے وہ اس کام کو مجھ سے بہتر انجام دے سکتے تھے، چنانچہ انھوں نے اس کام کو اس طرح انجام دیا کہ خاندانی حالات کے ساتھ مکاتیب شبلی کی متفرق معلومات کو بہ ترتیب یکجا کر دیا، ان اوراق کو مولانا شروانی اور مرحوم کے دوسرے احباب اور تلامذہ نے دیکھا تو اس مجموعہ میں زندگی کی روح نظر نہ آئی، پھر یہ کام مولانا کے پرانے شاگرد مولوی اقبال احمد صاحب سہیل، ایم، اے، ایل، ایل، بی، ایم، ایل، اے، وکیل اعظم گڑھ کے سپرد کیا گیا کہ وہ مولانا کے خاندانی تعلقات اور قدیم واقفیت کی بنا پر بہت کچھ لکھنے کے اہل تھے، چنانچہ انھوں نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا، اور مولوی عبدالسلام صاحب کے مسودہ کو گھٹا بڑھا کر اور علی گڑھ کے بہت سے نئے واقعات کا اضافہ کر کے اپنے زور قلم سے بزم میں رزم کی شان پیدا کر دی، ان کا یہ مضمون ''سیرت شبلی'' کے عنوان سے ''الاصلاح سرائے میر'' میں ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء کے چھ نمبروں میں مسلسل نکلتا رہا۔''(۲)

اقبال سہیل صاحب اس سلسلے کو برقرار نہ رکھ سکے، ۱۹۴۰ء سے سید صاحب نے مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کا مسودہ اور اقبال سہیل صاحب کے مضامین کو سامنے رکھ کر اس کام کا آغاز کیا، تین برسوں کی محنت کے بعد آٹھ سو پچاس صفحات کی یہ ضخیم کتاب فروری ۱۹۴۳ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی، اس کتاب کے بارے میں سید صاحب کا اپنا خیال یہ ہے کہ:

''خاکسار کو یہ دعویٰ نہیں کہ یہ تالیف سوانح عمریوں کے صحیح اصول پر پوری منطبق ہے، تاہم یہ کوشش کی گئی ہے کہ جو کچھ معلوم ہو اس کو بے کم وکاست سپردِ قلم کر دیا جائے، مولانا کے سوانح میں بعض رفقاء کار اور معاصرین سے کچھ الجھاؤ بھی رہا ہے، کوشش کی گئی ہے کہ اس کشمکش کے تاریخی اظہار میں تعلقات کے شیشوں کو قلم کی بے اعتدالی سے ٹھیس نہ لگنے پائے، اور کسی ناگوار واقعہ کے ذکر کے موقع پر بھی دامن کو راہ کے کانٹوں سے بچا کر نکالا جائے، تاہم نقائص اور عیوب بشریت کا خاصہ ہیں، اس لئے کوئی سوانح نگار اپنی نسبت معصومیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا، اور نہ کسی ایک فیصلہ کے متعلق سب کی رائیں ایک ہو سکتی

ہیں، کیوں کہ محبت اور عقیدت کی نظر جہاں مخدوموں کی بہت سی خامیوں کے دیکھنے سے قاصر رہتی ہے، وہاں بدگمانوں کی نگاہیں سب سے پہلے ان ہی پر پڑتی ہیں، اور ان کے تکرار واعادہ میں ان کو ایسی لذت ملتی ہے کہ وہ ممکن کمالات سے بھی اغماض برت جاتی ہیں، لیکن یہ دونوں باتیں درحقیقت نفسیاتی فطرت کے مطابق ہیں، اور اس میں معتقد اور منتقد دونوں معذور ہیں،.........رضامندی کی آنکھ ہر عیب کے مشاہدہ سے قاصر رہتی ہے، لیکن ناراضی کی آنکھ برائیوں ہی کو ظاہر کرتی ہے، بہرحال شبلی، شبلی تھے، جنیدؒ و شبلیؒ نہ تھے۔'' (۳)

ان معروضات کے بعد اب ہم اس کتاب پر ایک نظر ڈالتے ہیں، سب سے پہلے حیاتِ شبلی کے عنوان سے سید صاحب نے بارہ صفحات کی ایک تحریر رقم فرمائی ہے، جس کا ایک اقتباس ہم اوپر کی سطروں میں نقل کر چکے ہیں، پھر دیباچہ کے عنوان سے چالیس صفحات کی تحریر ہے جس میں حضرت مجدد الف ثانیؒ ، شاہ ولی اللہؒ، مولانا محمد احمد اللہؒ، مولانا قاسمؒ ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ، مولوی کرامت علیؒ جونپوری، مولوی چراغ علیؒ اور سرسیدؒ کی ان خدمات پر ایک سرسری سی نظر ڈالی گئی ہے جو ان حضرات نے دفاعِ اسلام کے سلسلے میں انجام دی تھیں، اس تحریر میں سرسید کے بعد مولانا شبلی کا ذکر کیا گیا ہے اور شبلی کی ان تمام خدمات کی طرف ایک اشارہ کر دیا گیا ہے جن کی تفصیل اس کتاب میں آگے آنے والی ہے، اس دیباچہ کے بعد ستاون صفحات کا ایک مقدمہ سامنے آتا ہے جس میں خلجی اور تغلق عہد کے علمائے خراسان کے ذکر سے بات شروع کی گئی ہے، بعد ازاں دیارِ پورب کے علمی مرکزوں اور وہاں کے علماء کا ذکر کرتے ہوئے علمائے جونپور اور علمائے ظفر آباد کی خدمات کو اجاگر کیا گیا ہے، یہ مقدمہ مدرسہ چشمۂ رحمت کے ذکر پر آ کر اختتام پذیر ہوتا ہے، اس طویل مقدمہ کے بعد آٹھ صفحات میں ''اعظم گڑھ اور اس کے اطراف'' کے عنوان سے سرکار جونپور کا رقبہ، اعظم گڑھ کی تاریخ، وہاں کے نومسلم خاندان، اعظم گڑھ کی وجہ تسمیہ اور مردم خیز قصبات کے بارے میں تاریخی اور جغرافیائی حقائق پیش کئے گئے ہیں، اس کے بعد جو ابواب لکھے گئے ہیں ان کی مکمل فہرست یوں ہے، ولادت اور تعلیم و تربیت (اس باب میں ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۸۸۲ء تک کے تمام واقعات اور مولانا شبلی کے مشاغل کا احاطہ کیا گیا ہے) تصنیف کا آغاز، سفرنامہ، کلیات اور رسائل، ندوۃ العلماء

یعنی علماء کی مذہبی اور تعلیمی اصلاح کی تحریک میں شرکت (اس باب میں ۱۹۰۴ء تک کے تمام اہم واقعات اور مولانا شبلی کے تمام مشاغل کا تفصیل سے ذکر ہے) دارالعلوم ندوۃ العلماء کی معتمدی (یہ باب ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۲ء تک کے حالات کا احاطہ کرتا ہے) الندوہ دارالعلوم ندوہ کی مالی ترقی سے متعلق مولانا کی خدمات، پاؤں کا حادثہ، بعض دوسری تعلیمی خدمات، مذہبی اور قومی کام، سیاسیات، ندوۃ العلماء میں مولانا کی مخالفت اور معتمدی سے استعفیٰ، بھائی کی وفات اور وطن کی بازگشت اور مرحوم بھائی کے ادھورے کاموں کی تکمیل کا عزم، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، دارالمصنفین، سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم، وفات، آل اولاد، اخلاق وعادات، مراثی وقطعات، اس عنوانات کی فہرست سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کتاب میں مولانا شبلی کی زندگی پر کس قدر تفصیل سے نظر ڈالی گئی ہے، اب ہم اس کتاب کے بعض مندرجات پر ایک اجمالی نظر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سید صاحب کے جس مقدمہ کا ذکر اوپر کی سطروں میں کیا گیا ہے، بلاشبہ وہ انتہائی مفید اور دلچسپ معلومات فراہم کرتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ وہ حیات شبلی کے پس منظر کا کام بھی انجام دیتا ہے، غالباً یہی وجہ ہے سید صاحب نے اتنا طول وطویل مقدمہ لکھ کر اس دانشوری کی روایت کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جس پر آگے چل کر شبلی کو اپنی تصانیف کی بلند وبالا اور سنگین عمارت قائم کرنی تھی۔

ولادت وتعلیم کے عنوان سے اس کتاب میں جو باب ملتا ہے اس میں حیات شبلی کے چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے اور ان واقعات کی روشنی میں یہ دیکھنے کی سعی کی گئی ہے کہ شبلی کی شخصیت کی تشکیل میں ان کے معاشرہ اور مذکورہ واقعات کا کیسا اور کتنا حصہ ہے؟ اس کے بعد سید صاحب نے شبلی کا جو مرقع کھینچا ہے اس میں تمام جزئیات آگئی ہیں، اگر انھوں نے ایم، اے، او کالج میں کسی کی آمد پر کوئی خیر مقدمی نظم بھی پڑھی ہے تو اس کو ایک ذیلی عنوان قائم کر کے حیات شبلی کا ایک نمایاں واقعہ بنا دیا گیا ہے، اس کتاب کے مطالعے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ سرسید اور شبلی میں اختلاف پہلی بار ایک تقریر کے سلسلے میں ہوا تھا جو جمہوریت کی تائید میں تھی، اس تقریر کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی رقمطراز ہیں:

''مولانا فرماتے تھے کہ ایک دفعہ یونین میں یہ بحث تھی کہ جمہوری طرز حکومت بہتر

ہے، یا شخصی؟ جلسہ میں سید صاحب بھی موجود تھے، مولانا نے جمہوری طرزِ حکومت کی تائید کی اور اس موضوع پر ایسی مدلل اور موثر تقریر کی کہ تمام طالب علموں نے ان کی موافقت میں رائے دی، یہ امر سید صاحب کے مذاقِ سیاست کے سراسر خلاف تھا، چنانچہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اس کے خلاف تقریر کی، بلکہ ایک مضمون بھی لکھا، تب جا کر کہیں ان کی طبیعت کی بھڑاس نکلی، سر سید نے اپنا یہ مضمون ایشیائی اسلامی طرزِ حکومت کے عنوان سے ۲۸ر جون ۱۸۹۲ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپوایا تھا۔'' (۴)

ہمارے نزدیک اس اقتباس کا یہ جملہ ''تب جا کر کہیں ان کی طبیعت کی بھڑاس نکلی۔ رائی کو پہاڑ بنانے کے مترادف ہے، ہم نے یہ خیال اس وجہ سے قائم کیا ہے کہ اس کے بعد کے پیراگراف میں سید سلیمان ندوی مرحوم نے یہ بتایا ہے کہ اسی سال جب مولانا شبلی کا مقالہ کتب خانہ اسکندریہ شائع ہوا اور اس سے قبل جو مقالہ انھوں نے جزیہ کے عنوان سے لکھا تھا دونوں مقالوں نے تحقیق کی دنیا میں دھوم مچا دی، ان مقالات کو پڑھنے کے بعد سر سید کو یہ خیال آیا کہ مغربی مصنفین نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو تاریخی غلط فہمیوں کا انبار لگا رکھا ہے اس کے سدباب کے لئے ایک مجلس قائم کی جائے۔ سر سید نے اپنی اس تجویز کا خاکہ ۱۸۹۲ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع کیا اور اس میں یہ بھی اعلان کیا کہ مولانا شبلی کے مذکورہ بالا دونوں مقالے اس سلسلے میں داخل کئے جاتے ہیں۔ اگر سر سید کے دل میں شبلی کے خلاف کوئی بغض ہوتا تو وہ ۱۸۹۲ء میں جب کہ انھوں نے ''اپنے دل کی بھڑاس'' نکالنے کے لئے شبلی کے مقالے کا جواب لکھا تھا، اسی ۱۸۹۲ء میں ان کو ''صیغۂ تصحیح تاریخ'' کا سکریٹری کیوں بناتے؟ اور ان کے مقالات کو اس سلسلے میں شامل کیوں کرتے؟ شبلی اور سر سید دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کا مقلد نہ تھا، دونوں ہی اپنی الگ الگ اور مجتہدانہ رائے رکھتے تھے اور اس اختلافِ فکر ونظر کو دونوں چھپاتے نہ تھے، بلکہ برسرِ عام ظاہر کر دیا کرتے تھے، جو ہمارے نزدیک دونوں ہی کی عظمت کی دلیل ہے، سید سلیمان ندوی مرحوم نے اس موضوع کو بہت پھیلا کر لکھا ہے اور کتاب کے سترہ صفحات میں یہ داستان بیان کی ہے، جس میں مولانا شبلی کا برسرِ حق اور سر سید کا برسرِ باطل ہونا بڑے فنکارانہ انداز میں بیان کیا ہے، جس کے جواب میں چند برسوں ہی میں کئی کتابیں سامنے آئیں، امین زبیری کی ''ذکرِ شبلی'' (۱۹۴۶ء) تبصرۂ حیاتِ شبلی، وحید قریشی کی

"شبلی کی حیات معاشقہ" (۱۹۵۰ء) اور شیخ اکرام کی شبلی نامہ عام طور سے قابل ذکر ہیں۔ علاوہ بریں اس زمانے کے ماہناموں ہفت روزوں اور سہ روزوں میں اس موضوع کی تائید یا مخالفت میں جو ہنگامہ برپا رہا وہ الگ ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سرسید اور شبلی دونوں کے فکر و نظر میں اختلاف تھا، یہ اختلاف کہیں معمولی انحراف ہوتا اور کہیں سنگین اختلاف، اگر صرف اس اختلاف فکر و نظر کی صحیح اور مکمل تصویر کشی، حیات شبلی میں کر دی جاتی تو شاید اس کے رد عمل میں اتنی کتابیں اور مقالے منصۂ شہود پر نہ آتے، مگر چونکہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے اس کتاب میں یک رخی تصویر پیش کی ہے اس لئے اس سے ہنگامہ برپا ہونا لازمی تھا، ہم نے یکرخی تصویر کا جو لفظ استعمال کیا ہے، اس کی وضاحت درج ذیل مثال سے ہو جائے گی، سید سلیمان ندوی مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

> "ایک دفعہ سرسید نے مولانا سے پوچھا کہ ہمارے کالج میں ان تاکیدوں کے باوجود لڑکے نماز کے پابند کیوں نہیں ہوتے؟ فرمایا اس لئے کہ وہ آپ کو پڑھتے نہیں دیکھتے، آپ شام کو کالج کی تعمیرات دیکھنے مسجد کے سامنے آتے ہیں، مغرب کی اذان اور نماز ہو جاتی ہے، اور آپ شریک نہیں ہوتے، وہ سمجھتے ہیں کہ آپ نماز نہیں پڑھتے، انھیں کیا معلوم کہ آپ کو سلسل البول کی وجہ سے کپڑے اتارنے پڑتے ہیں اور آپ دو نمازیں ملا کر (جمع بین الصلوتین) پڑھتے ہیں۔" (۵)

سید سلیمان ندوی مرحوم کا درج بالا اقتباس بلا کسی حوالے کے تحریر ہوا ہے، انھوں نے یہ بھی تحریر نہیں فرمایا کہ ان کو یہ معلومات خود مولانا شبلی کی زبان سے حاصل ہوئی ہیں، ہم کو اس بات کے ماننے میں تامل ہے کہ کالج کے لڑکے سرسید کو نماز پڑھتے نہ دیکھتے رہے ہوں گے، خود علامہ شبلی نے سرسید کا کالج کی مسجد میں نماز پڑھنے اور آمین بالجہر کی آواز سے مسجد کے گونج اٹھنے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

> "مغرب کی نماز سبحان اللہ! کیا شان و شوکت ہوتی ہے کہ بس دل پھٹا پڑتا ہے، خود سید صاحب بھی شریک نماز ہوتے ہیں، اور چونکہ وہ عامل بالحدیث ہیں، آمین زور سے کہتے ہیں، ان کی آمین کی گونج مذہبی جوش کی رگ میں خون بڑھا دیتی ہے۔" (۶)

اسی ایک مثال سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ شبلی کی ہر بات کو صحیح اور سرسید کی ہر بات کو غلط ثابت کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے، اور اس سلسلے میں ان کو بلاحوالہ اطلاعات فراہم کرنے میں بھی کوئی جھجھک محسوس نہیں ہوتی۔

جہاں تک سرسید کی مذہبی فکر کا سوال ہے اس سلسلے میں یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سرسید کی مذہبی فکر سے اختلاف کرنے والے صرف علامہ شبلی ہی نہ تھے، بلکہ سرسید کی جماعت کے اور افراد مثلاً محسن الملک، نذیر احمد حتیٰ کہ مولانا حالی بھی بعض مسائل کے سلسلے میں ان سے اختلاف رائے رکھتے تھے، امت مسلمہ میں یہ اختلاف رائے کوئی نئی بات نہیں ہے، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ جو کہ سنیوں کے چار فقہوں کے بانی مبانی ہیں کیا ان کے زمانے کے علماء نے ان سے اختلاف نہیں کیا؟ کیا امام غزالیؒ، امام ابن تیمیہ، امام رازی، ابن قیم، ابن جوزی کی نکیر ان کے زمانے کے بعض علماء نے نہیں کی؟ خود ہمارے زمانے میں مولانا مودودیؒ کے افکار و خیالات سے مولانا حسین احمد مدنی کھلا اختلاف نہیں رکھتے تھے، اس لئے اگر سرسید کی مذہبی فکر کے بعض اجزاء سے اس زمانے کے بعض علماء نے اختلاف کیا تو اس سے یہ بات کہاں ثابت ہوتی ہے کہ سرسید کی ہر بات حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کے قابل ہے، سرسید نے اپنی تفسیر میں خرقِ عادت سے جو انکار کیا ہے اس کو سید سلیمان ندوی مرحوم بڑے جلی حروف میں ''ان کا بڑا کارنامہ'' قرار دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ مولانا شبلی نے الکلام میں ایک موقع پر اس خیال کی کس طرح تردید کی ہے، یہ تو رہا سید سلیمان ندوی مرحوم کا خیال لیکن صورت حال یہ ہے کہ سرسید کی مذہبی فکر سے علامہ شبلیؒ مرحوم کے ماموں زاد بھائی اور مشہور مفسر قرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے، اس سلسلے میں ہم صرف ایک مثال پیش کر کے اس بحث کو ختم کر دینگے۔

سرسید نے سورہ فیل کی تفسیر لکھتے ہوئے اس معروف قول کو نہیں تسلیم کیا کہ پرندوں نے ابرہہ کی فوج پر کنکریاں برسائیں جس کے نتیجے میں وہ تباہ و برباد ہوگئی، سرسید کی رائے یہ تھی کہ ابرہہ کی فوج میں چیچک پھیل گئی تھی جس سے وہ ہلاک ہوئی، سرسید اپنے اس قول میں منفرد ہیں، ان کی اس تفسیر کا اثر مولانا حمید الدین فراہی نے یوں قبول کیا ہے کہ انھوں نے سورۂ فیل کی تفسیر لکھتے وقت اس معروف قول کو نہیں لیا ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، بلکہ انھوں نے لکھا ہے کہ حاجیوں نے کعبہ کو

بچانے کے لئے پہاڑوں کے اوپر سے ابرہہ کی فوج پر سنگ باری کی جس کی وجہ سے وہ تباہ ہوئی۔

(۷) اس مثال سے صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ سرسید کے خیالات دیوانے کی بڑ نہ تھے بلکہ اس سے اصحاب علم بھی متاثر ہوئے، مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اس سلسلے میں جہاں جہاں بھی ممکن ہوسکا ہے سرسید کی شخصیت کی تخفیف کی ہے اوران کو علم دین سے بے بہرہ دکھانے کی کوشش کی ہے اوراس اختلاف فکرونظر کو شبلی کی علی گڑھ سے علاحدگی کا سبب قرار دیا ہے، اگر علامہ شبلی کی علاحدگی کا یہ سبب ہوتا تو وہ سرسید کی زندگی ہی میں علی گڑھ کو خیر باد کہہ دیتے ان کے مرنے کا انتظار کیوں کرتے؟ یہی وجہ ہے کہ ہم نے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی تحریر کو یک رخی تصویر کہا ہے۔

ندوۃ العلماء یعنی علماء کی مذہبی و تعلیمی تحریک میں علامہ شبلی کی شرکت سے جس وزن و وقار کا اضافہ ہوا اوراس تحریک کی پیش رفت میں ان کا جو حصہ تھا، مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کی تفصیل بڑی جاں سوزی سے مرتب کی ہے اور علامہ شبلی کی زندگی کے اس دور کے بارے میں تمام جزئیات کو جمع کردیا ہے، اس تحریک کی کامیابی کے بعد جب دارالعلوم ندوۃ العلماء قائم ہوگیا تو مولانا شبلی اس کے ہر کام میں پیش پیش رہے، پھر ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۳ء تک انھوں نے معتمد تعلیمات کا عہدہ سنبھالا اور ندوہ کو ترقی دینے میں منہمک ہوگئے، پھر ۱۹۱۳ء میں شبلی اور دیگر اراکین ندوہ سے ایسے اختلافات ہوئے جو روز بروز بڑھتے ہی گئے، ان اختلافات کا خاتمہ شبلی کے استعفیٰ پر ہوا، ان تمام واقعات کو مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے بہت تفصیل سے تحریر کیا ہے، مگراس باب میں بھی انھوں نے کسی ایک جگہ اس بات کی طرف اشارہ نہیں کیا کہ اس معاملۂ خاص میں شبلی سے بھی کوئی چوک ہوئی، ان کے نزدیک اس مناقشے کے درمیان شبلی کا ہر عمل مبنی برحق اور دوسروں کا مبنی بر باطل ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ باب ہیرو پرستی کا شکار ہوکر رہ گیا۔

شبلی کی تعلیمی خدمات، مذہبی اور قومی کام، سیاسیات اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوان سے جو باب لکھے گئے ہیں وہ سید سلیمان ندوی کی محنت اور دقت نظر کے مظہر ہیں، یہ وہ ابواب ہیں جو شبلی پر کام کرنے والوں کے لئے ہمیشہ ماخذ کا کام دیتے رہیں گے، اسی طرح اخلاق وعادات کے عنوان سے جو باب اس کتاب میں شریک اشاعت ہے وہ بھی خاصے کی چیز ہے، اس کے مطالعے سے مولانا شبلی کے شب وروز کا پروگرام اوران کی پسند وناپسند پر روشنی پڑنے کے ساتھ

ساتھ ان کے تعلیمی انداز پر بھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔

غرض کہ یہ سوانح عمری، مشرقی ادبیات کی روایت کی پاسدار ہے یعنی شبلی کے الفاظ میں اس کو کتاب المناقب اور مدلل مداحی کہا جاسکتا ہے، اس سوانح عمری کے خلاف بہت سے تبصرے ہوئے جو افراط وتفریط کے شکار تھے، ہمارے نزدیک اس کتاب پر سب سے اچھا اور متوازن تبصرہ پروفیسر آل احمد سرور صاحب کا ہے، جس کے ایک اقتباس پر ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں، سرور صاحب حیات شبلی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کتاب میں بعض اور بھی خامیاں ہیں، شبلی کے پاؤں کے واقعہ پر جتنے قصائد اور نظمیں لکھی گئی ہیں، سب خواہ مخواہ درج کی گئی ہیں، بہت سے واقعات دہرائے گئے ہیں، ندوہ کے واقعات کی اتنی تفصیل کی ضرورت نہ تھی، نہ یہ ثابت کرنے کی ضرورت تھی کہ اس زمانے کے جتنے نیک کام تھے ان میں مولانا شبلی کا ہاتھ ضرور تھا، سرسید کی انگریز پرستی پر اعتراض ہے، مگر شبلی جب انگریز گورنر کو بلا کر ندوے کا سنگ بنیاد رکھتے ہیں تو اس کی دبی زبان سے تعریف کی گئی ہے، غرض حیات شبلی باوجود اپنے واقعات کی تفصیل اپنے موضوعات ومباحث کی وسعت وجامعیت کے باوجود اپنے حوالوں کی صحت اور اپنی استدلال کی وضاحت کے شبلی کی ترجمانی ہے، ان پر تنقید نہیں، حیاتِ جاوید اور حیاتِ شبلی ایک دوسرے سے اتنی دور ہونے پر بھی بہت قریب ہیں، دراصل ہمارے دور کو صرف سرسید اور شبلی کے بجائے دونوں کی ضرورت ہے، اور جس طرح محمد علی اور اقبال نے دونوں سے فیض حاصل کیا، اسی طرح ہم بھی کر سکتے ہیں۔'' (۸)

حیات شبلی پر جو تیز وتند تبصرے ہوئے اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اس کتاب میں شبلی کو جنید وشبلیؒ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، شبلی کو شبلی نہیں رہنے دیا ہے۔

☆☆☆

حواشی:

(۱) مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۸۳ء، ص ۵۔

(۲) مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۶-۷۔

(۳) مولانا سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، ص ۸-۹۔

(۴) مولانا سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، ص ۱۶۔

(۵) مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۲۸۸۔

(۶) مکاتیب شبلی، حصہ اول، طبع چہارم مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۶۶ء ص ۴۶۔

(۷) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر سورۂ "فیل" مولانا شبیر احمد، الرشاد، اعظم گڑھ۔ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۸۵ء ص ۶-۱۸۔

(۸) آل احمد سرور، تنقیدی اشارے، ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۵۵ء ص ۲۰۲،۲۰۱۔

❁❁❁

حیات سلیمان

مولانا سید سلیمان ندوی کے انتقال کے بعد معارف نے سلیمان نمبر نکال کر ان کی مذہبی، علمی، ادبی اور تاریخی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا، اس نمبر کے بیشتر مقالہ نگار یا تو ان کے احباب تھے یا شاگرد، لیکن سید صاحب سے گرویدگی رکھنے والے اصحاب کو معارف کے سلیمان نمبر سے تشفی نہ ہوئی اور ان کی طرف سے بار بار یہ تقاضا ہوتا رہا کہ سید صاحب کی مکمل اور مبسوط سوانح لکھ کر دارالمصنفین شائع کرے، جب یہ تقاضا حد سے زیادہ بڑھ گیا تو شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور سید صاحب کے انتقال کے بیس برس کے بعد ان کی سوانح ''حیات سلیمان'' کے نام سے شائع ہو کر منظر عام پر آئی جو سات سو انتیس صفحات پر محیط ہے، ان صفحات میں وہ تمام مراثی جو ان کے انتقال کے بعد شائع ہوئے اور ستائیس صفحات کا ضمیمہ بھی شامل ہے۔

شاہ صاحب نے اپنے مقدمہ میں حیات سلیمان کے ۔ ت ماخذ تحریر فرمائے ہیں، جن کی مدد سے یہ ضخیم کتاب لکھی گئی ہے، جو درج ذیل ہے۔

> [۱] ''سید صاحب کی زندگی میں اکثر ان کے حالات کی فرمائشیں آتی تھیں، اس لئے سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے ان کے مختصر حالات قلم بند کر دئے تھے، جس کی نقل فرمائش ۔ نے والوں کو بھیج دی جاتی تھی، سید صاحب کی وفات کے بعد صباح الدین صد حب نے اس کو بڑھا کر مختصر سوانح کی شکل میں کر دیا، جو سلیمان نمبر میں شائع ہو چکی ہے، اس میں سید صاحب کی سوانح کا مختصر مگر جامع خاکہ آ گیا ہے۔
>
> [۲] خاندانی حالات سید صاحب ۔ کے پھوپھی زاد بھائی بچپن کے ساتھی اور ہم درس مولوی نجم الہدیٰ کی زبانی اور تحریر سے ماخوذ ہیں۔

[۳] ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ سے لے کر قیام دارالمصنفین تک کے حالات خود سید صاحب نے حیات شبلی میں لکھ دئے ہیں، اس کے علاوہ کچھ حالات ان کے مضمون ''میری محسن کتابیں'' اور بعض دوسری تحریروں میں بھی ہیں۔

[۴] سب سے بڑا اور مستند ماخذ معارف کے شذرات اور مضامین ہیں جس میں وہ اکثر اپنی مشغولیتوں اور سفر وغیرہ کا حال لکھتے تھے، اور ہر قسم کے اہم مسائل پر اظہار خیال کرتے تھے، اس لئے اس کی حیثیت خودنوشت سوانح کی ہے۔

[۵] اخلاق وسیرت کے حالات کچھ ذاتی علم سے لکھے ہیں، اور بیشتر سید صاحب کے بھتیجے مولانا ابوظفر صاحب مرحوم اور ان کے پرانے رفیق مولانا عبدالباری صاحب ندوی اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کے سلیمان نمبر کے مضمون سے ماخوذ ہیں۔

[۶] راقم الحروف کو ۱۹۲۴ء سے ۱۹۴۶ء یعنی سید صاحب کے بھوپال جانے تک ان کی ملازمت کا شرف حاصل رہا، بھوپال کے قیام کے زمانہ میں مستقل خط وکتابت رہتی تھی، اور وقتاً فوقتاً اعظم گڑھ بھی تشریف لاتے رہے، اس لئے اس زمانے کے حالات چشم دید ہیں۔

[۷] پاکستان جانے کے بعد مستقل خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا، اس لئے اس زمانہ کے حالات کچھ ان خطوط اور بیشتر حالات ان کے مرشد مولوی غلام محمد صاحب کی کتاب تذکرۂ سلیمان سے ماخوذ ہیں جن کے وہ عینی شاہد ہیں۔''(۱)

ان ماخذ پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ شاہ صاحب کے پیش نظر زیادہ تر معارف کے سلیمان نمبر کے مطبوعہ مقالے رہے ہیں، کچھ مدد انھوں نے سید صاحب کے ان خطوط سے بھی لی ہے جو ان کے نام لکھے گئے، اس کے علاوہ انھوں نے حیات سلیمان لکھنے کے لئے کوئی خاص کدو کاوش نہیں کی، بہر حال دیکھنا یہ ہے کہ یہ کتاب اردو کے سوانحی ادب میں کیا حیثیت رکھتی ہے، اور اس سے صاحب تذکرہ کی کیسی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے مزید برآں اس کتاب کی تاریخی اہمیت کیا ہے؟ قبل اس کے کہ ہم اس کتاب کا ناقدانہ جائزہ لیں شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کا ایک اقتباس نقل کررہے ہیں تاکہ اس بات کا اندازہ ہوسکے کہ یہ سوانح کن خطوط پر اور کن تحفظات و تاملات کے ساتھ مرتب کی گئی ہے۔

''ایک زمانہ میں جب تنقید کا دائرہ اتنا وسیع نہیں ہوا تھا اور نگاہ میں اتنی خوردہ گیری اور قلم میں بیباکی نہ پیدا ہوئی تھی، سوانح عمری لکھنا بہت آسان تھا، اکابر کے حالات اسوۂ حسنہ کی حیثیت سے لکھے جاتے تھے، اور عقیدت کے دل سے قبول کئے جاتے تھے لیکن اب یہ پرانے آداب ختم ہو گئے ہیں، خوبیوں کے بجائے عیب ڈھونڈنا ہنر بن گیا ہے، اس لئے سوانح عمری لکھنا بڑا دشوار ہو گیا ہے، چنانچہ اس دور کی بڑی سے بڑی شخصیت اور سوانح عمری بھی تنقید کی جراحت سے محفوظ نہیں، اس لئے یہ توقع رکھنا کہ یہ سوانح عمری ہر ذوق اور معیار پر پوری اترے گی، ایک غلط توقع ہوگی، لیکن اس کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ قلم جادۂ حق وصواب سے ہٹنے نہ پائے، اور حتی الامکان صاحب سوانح کی صحیح تصویر پیش کر دی جائے، اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے اس کا فیصلہ اہل نظر کریں گے، مگر یہ ملحوظ رہے کہ ایک جلیل القدر شخصیت اور ایک شفیق استاد کی یہ سوانح عمری ایک ادنیٰ شاگرد کے قلم سے ہے، اس لئے اگر کہیں جذباتی عقیدت کا پرتو نظر آئے تو اس کو معذور سمجھا جائے۔'' (۲)

سب سے پہلے ہم اس کتاب کا اس حیثیت سے مطالعہ کرتے ہیں کہ اردو کے سوانحی ادب میں اس کا درجہ کیا ہے؟ جیسا کہ معلوم ہے شاہ صاحب کے زمانہ تک سرسید کی ''سیرت فریدیہ'' سے لے کر مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ''سیرت سید احمد شہید'' تک صدہا کتابیں شائع ہو کر منظر عام پر آچکی تھیں، خود علامہ شبلی کی سوانحی کتابیں اور ''حیات شبلی'' بھی شاہ صاحب کے پیشِ نظر تھیں مگر یہ دیکھ کر انتہائی تعجب ہوتا ہے کہ وہ سوانح نگاری کے اس معیار کو بھی قائم نہیں رکھ سکے جو حیات شبلی میں ملتا ہے، سید صاحب نے شبلی کی جو مرقع کشی کی ہے اس سے کسی کو خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو مگر اس بات کا اعتراف سب ہی لوگ کریں گے کہ حیاتِ شبلی میں سید صاحب نے جو تاریخی معلومات فراہم کی ہیں وہ استناد کا درجہ رکھتی ہیں اور ان کی مدد سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ شبلی کے معاشرہ کے مسائل کیا تھے، اس زمانے کی قدریں کیا تھیں؟ سیاسی وقوعات کیا تھے اور ان سب نے مل کر شبلی کی شخصیت کی تشکیل کس انداز سے کی، شاہ صاحب نے حیات شبلی کی طرح نہ تو سید صاحب کے معاشرہ کے حالات سے کوئی خاص بحث کی ہے، نہ ان کے مولد کی علمی روایات کو کدو کاوش اور مورخانہ بصیرت کے ساتھ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے، انھوں نے سہل انگاری سے

کام لیتے ہوئے معارف کے مطبوعہ مضامین سے لمبے لمبے اقتباسات نقل کر کے سید صاحب کے معاشرہ اور اس زمانے کی تعلیمی روایات کو اجاگر کر دینا ہی کافی سمجھا، سید صاحب کی سیرت کی تشکیل کے عوامل کیا رہے ہیں شاہ صاحب اس سے بھی یکسر صرف نظر کر گئے ہیں، اس طرح اس کتاب کو اردو کے سوانحی ادب میں کوئی اعلیٰ مقام دینا مشکل ہے زیادہ سے زیادہ اس کو اوسط درجے کی سوانحی کتاب کہا جا سکتا ہے۔

شاہ صاحب کی اس کتاب میں ایک کمی یہ بھی محسوس ہوتی ہے کہ انھوں نے سید صاحب کو جامع کمالات ثابت کرنے پر اپنا سارا زورِ قلم صرف کر دیا ہے، مگر ان کے اصل و حقیقی کارنامے کو جس طرح اجاگر کرنا چاہیے تھا اس طرح نہیں کر سکے، سید صاحب کا اصل کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے علامہ شبلی کے نامکمل کاموں کو خود بھی مکمل کیا اور دوسرے رفقائے دارالمصنفین سے بھی اسی نوعیت کا کام لیا، علاوہ بریں تاریخ اسلام اور تاریخ ہند کا جو خاکہ علامہ شبلی نے بنایا تھا اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے دارالمصنفین سے کتابیں لکھیں، لکھوائیں اور شائع کیں، اگر شاہ صاحب سید صاحب کے اس وصف کو اپنے مطالعہ کا موضوع بناتے تو اس سے سید صاحب کی خدمات بھی نمایاں ہوتیں اور دارالمصنفین کی مطبوعات کی اہمیت بھی واضح ہو جاتی، شاہ صاحب نے ان کی تمام تصانیف کا ذکر تو کر دیا ہے مگر اپنے قارئین کو یہ نہیں بتلایا کہ اس کتاب کو سید صاحب نے کیوں لکھا اور یہ کتاب شبلی کے نامکمل مشن کی کس حد تک تکمیل کرتی ہے، شاہ صاحب کی طبیعت میں اختراع اور نقد کا مادہ نہ ہونے کے برابر تھا اس لئے وہ نقل و ترجمہ کا کام تو بڑا اچھا انجام دیتے تھے، ان کی زبان چونکہ شستہ اور پر لطف تھی اس لئے ان کی تحریروں کو پڑھنے میں لطف بھی آتا ہے، مگر ان کی تمام کتابیں اختراع و نقد کے وصف سے عاری ہیں، حیات سلیمان بھی ان کی اسی روش کی غماز ہے جس میں نقد و اختراع کی پرچھائیں تک نظر نہیں آتی، مثلاً سیرت النبی جلد سوم کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''اسی زمانہ میں (۱۹۲۰ء) سیرت کی تیسری جلد لکھی، یہ جلد معجزات پر ہے، اس کا کچھ حصہ مولانا عبدالباری کے قلم سے ہے، جس کی تصریح مقدمہ میں موجود ہے، ۱۹۲۴ء میں یہ جلد شائع ہوئی۔'' (۳)

یہاں پر شاہ صاحب کو اس بات پر روشنی ڈالنی چاہئے تھی کہ معجزات پر الگ سے ایک جلد

لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی، اور اس کو اس قدر پھیلا کر کیوں لکھا گیا؟ معجزات کے سلسلے میں علامہ شبلی کا موقف کیا تھا اور انھوں نے اس سلسلے میں اگر کچھ لکھا ہے تو اس میں اور سید صاحب کے افکار میں مماثلت ہے یا اختلاف، اسی طرح اگر شاہ صاحب نے سید صاحب کی تصانیف پر نظر ڈالتے وقت اختراع ونقد سے کام لیا ہوتا تو سید صاحب کی اوّلیات اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتیں، سید صاحب کی سیاسی زندگی ان کے اسفار، علمی مجلسوں میں ان کی شرکت اور اس طرح کے موضوعات کو جس طرح پھیلا کر لکھا گیا ہے اگر اسی طرح ان کی تصانیف کا بھی جائزہ لیا جاتا تو حیات سلیمان کے مطالعے سے سید صاحب کی واضح، روشن اور صحیح تصویر ہمارے سامنے جلوہ گر ہو جاتی، اس لئے یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ حیات سلیمان میں سید صاحب کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ ادھوری ہے، یہ تصویر صرف اسی وقت مکمل ہو سکتی تھی جب کہ ان کی تصانیف سے بھی سیر حاصل بحث کی جاتی۔

حیات سلیمان میں شاہ صاحب نے ''بزم رفتہ کی یاد'' کے عنوان سے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس سے سید صاحب کے احباب کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہیں، مگر اس باب کو پڑھ کر یہ تکلیف دہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انھوں نے اپنے دو بزرگوں مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی کے ساتھ انتہائی ناانصافی سے کام لیا ہے، مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کے بارے میں انھوں نے تحریر فرمایا ہے:

> ''احباب میں ایک نام مولانا عبدالسلام ندوی کا بھی ہے، وہ بڑے بھولے بھالے لا ابالی اور مجلسی آداب و رسوم سے بے نیاز تھے، ان میں نہ دوست بننے کی صلاحیت تھی نہ دوست بنانے کی، لیکن سید صاحب کے پچاس سال کے رفیق تھے، طالب علمی کے زمانہ سے سید صاحب کے پاکستان جانے تک ساتھ رہا، دارالمصنفین کے آغاز سے لے کر موت تک اس سے وابستہ رہے، اور اس کے مصنفین میں سید صاحب کے بعد علمی دنیا میں ان ہی کا نام لیا جاتا تھا، وہ بڑے بھولے تھے، ہر شخص ان کے بھولے پن سے لطف لیتا تھا، سید صاحب بھی لطف اندوز ہوتے تھے، اوران کی آزادہ روی کی بنا پر ان کو ''بت بے پیر'' فرمایا کرتے تھے، ان کے بہت سے لطائف وظرائف ہیں، ۱۹۵۶ء میں انتقال کیا، اور

دارالمصنفین میں دفن ہوئے۔" (۴)

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم مئی ۱۹۱۵ء میں دارالمصنفین کے رفیق کی حیثیت سے آئے زندگی بھر اس کی بے لوث خدمت کرتے رہے اور تین چار اکتوبر ۱۹۵۶ء کی درمیانی شب میں بحیثیت رفیق درالمصنفین اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کی، سید صاحب ان کے پانچ ماہ بعد تشریف لائے اور جون ۱۹۴۶ء میں بھوپال چلے گئے، مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم تقریباً اکتالیس سال پانچ ماہ تک اس ادارہ کی خدمت کرتے رہے، یہ وہی مولانا عبدالسلام ندوی ہیں جن کے بارے میں علامہ شبلی نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

> "ہمارے ہاں یعنی ندوہ میں عبدالسلام نہایت قابل لڑکا ہے، جو غالباً خالی ہونے والی کرسیوں کا مستحق ہوگا۔" (۵)

> "اگر عبدالسلام (سابق ایڈیٹر الندوہ) کو آپ کچھ مدت کے لئے بلاسکیں تو پورا کام چل جائے، وہ وسیع النظر ہیں، اور استخراج کا پورا ملکہ ہے۔" (۶)

> "میں تو کیا لکھ سکنے کے قابل ہوں، مولوی عبدالسلام کو تاکید کرتا ہوں۔" (۷)

> "لیکن حقیقت یہ ہے کہ خالص فارسی دانی میں عبدالسلام کو ان پر (سید سلیمان ندوی) ترجیح ہے۔" (۸)

اور نواب عمادالملک مولانا سید حسین بلگرامی نے ان کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

> "عبدالسلام ندوی کی تصنیفات کوئی دیکھے! کیا اس تحقیق اور جامعیت کے ساتھ نئے تعلیم یافتہ ایک صفحہ بھی لکھ سکتے ہیں۔" (۹)

ان کے علاوہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کے نزدیک مولانا عبدالسلام ندوی اس علمیت کے حامل ہیں۔

> "سیرت الصحابہؓ پر مولوی عبدالسلام نے جو مقدمہ لکھا ہے، وہ شائع ہونے پر اس زمانہ کی بہترین تصنیف خیال کیا جائے گا۔" (۱۰)

جنگ آزادی کے بطل جلیل مولانا ابوالکلام آزاد کے نزدیک مولانا عبدالسلام ندوی کی

علمیت کا پایہ یہ ہے۔

''آپ ہمارے مولوی عبدالسلام صاحب کے حسن اخذ وترتیب وتزئین مطالب کا سلیقہ دیکھتے ہیں؟ صرف بغدادی کی ایک کتاب الفرق سے ایک اچھا خاصہ پورا مضمون لکھ لیا، چونکہ اس میں بعض تفصیلات نئی ملتی ہیں، اس لئے ہمیشہ یہ خیال ہوتا تھا کہ اس پر ریویو لکھا جائے، لیکن مولوی عبدالسلام صاحب نے ایک مضمون تیار کر لیا۔''(۱۱)

ایک ایسے شخص کے بارے میں جس کی ساری زندگی علم وادب کی خدمت میں بسر ہوئی اور اس کی صلاحیتوں کا اعتراف مولانا شبلی سے لے کر مولانا آزاد تک نے کیا، شاہ صاحب کے درج بالا اقتباس میں اس کی تصنیفی لیاقت پر ایک سطر بھی نہیں لکھی جاتی نہ ہی یہ بتلایا جاتا کہ شبلی کے کن کن خوابوں کی تکمیل ان کے قلم کی رہین منت ہے، ان کے بارے میں جو سب سے ''اہم'' اطلاع فراہم کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ''وہ بڑے بھولے بھالے تھے ہر شخص ان کے بھولے پن سے لطف لیتا تھا۔'' یہ ناانصافی شاہ صاحب سے اس لئے سرزد ہوئی کہ سید صاحب کے پاکستان جانے کے بعد دارالمصنفین کے رفقاء دو واضح کیمپوں میں بٹ گئے تھے، ایک طرف وہ رفقاء تھے جو سید صاحب کے ساختہ و پرداختہ تھے، دوسری طرف مولانا مسعود علی ندوی۔ مولانا عبدالسلام ندوی کا خیال تھا کہ دارالمصنفین کی بقا کے لئے مولانا مسعود علی ندوی کا وجود لازمی ہے، جس سے شاہ صاحب کو شدید اختلاف تھا، اسی بنا پر شاہ صاحب نے مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کے انتقال کے بعد بھی نہیں بخشا اور حیات سلیمان میں ان کو ایک دیہقانی بنا کر پیش کیا۔

اس باب میں مولانا مسعود علی ندوی مرحوم کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی اسی کیفیت کا غماز ہے، مولانا مسعود علی ندوی، شبلی کے عزیز شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کے ہم سبق تھے، ۱۹۱۳ء میں ندوۃ العلماء کی جو مشہور اسٹرائک ہوئی تھی اس کو منظم کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا، علامہ شبلی ان کی تنظیمی لیاقت کے بڑے قائل تھے جس وقت شبلی نے انتقال کیا وہ ان کے پاس ہی موجود تھے، ان کے انتقال کے بعد دارالمصنفین کے سلسلے میں جو کچھ بھی ہوا وہ تمام کاموں میں شریک رہے، تاسیس دارالمصنفین کے بعد وہ اس کے عملی ناظم ہوئے اور زندگی بھر اس عہدے پر فائز رہے، مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم ہی کی طرح انھوں نے بھی مرتے دم تک

استاد کی چوکھٹ کو نہ چھوڑا اور مرکر وہیں کی زمین کا پیوند بنے۔

شاہ صاحب نے مولانا مسعود علی ندوی مرحوم کا خاص طور سے دو جگہوں پر ذکر کیا ہے، ایک اس جگہ جس کا ذیلی عنوان ''دارالمصنفین کی ناخوشگوار فضا'' ہے، دوسرا اس جگہ جہاں سید صاحب کے احباب کا ذکر ہے، اس موقع پر تفہیم مسئلہ کے لئے ہم شاہ صاحب کا ایک طویل اقتباس نقل کرتے ہیں۔

''حقیقت یہ ہے کہ بھوپال سے علاحدگی کے بعد سید صاحب کی اصلی جگہ دارالمصنفین ہی تھی، مگر یہاں ان کو امن وسکون حاصل نہ تھا ان کے اور مولوی مسعود علی صاحب کے اختلاف اس درجہ کو پہنچ گئے تھے کہ ان کی اصلاح کی کوئی شکل باقی نہ رہ گئی تھی، ایک زمانہ میں ان دونوں کا اتحاد ضرب المثل تھا، اور دونوں نے مل کر دارالمصنفین کو پروان چڑھایا تھا، لیکن پھر اختلاف بھی اس درجہ کا ہوگیا، اس کا سبب دونوں کا اختلاف مزاج تھا، سید صاحب نرم خو، حلیم الطبع اور متحمل مزاج تھے، اختلاف اور جنگ ومقابلہ سے گھبراتے تھے، ان کی ایک سطح تھی، جس سے کسی حال میں نیچے نہ اتر سکتے تھے، مولانا مسعود علی صاحب کا مزاج اس کے بالکل برعکس تھا اب اس کی تفصیل کیا لکھی جائے...... وہ کسی معاملہ میں ادنیٰ اختلاف رائے کو بھی نہیں برداشت کر سکتے تھے، دارالمصنفین کے معاملات میں بھی استبداد اور مطلق العنانی سے کام لیتے تھے اور اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے ان کو کسی بات میں تامل نہ تھا، اس لئے دونوں میں اختلاف بڑھتا گیا، جس کا اثر دونوں کے گھروں سے لے کر دارالمصنفین کے معاملات تک پہنچ گیا، سید صاحب اس کو اپنی طبعی بردباری اور دارالمصنفین کے مصالح کی خاطر برداشت کرتے رہے، لیکن آخر میں ان کی قوت برداشت جواب دے گئی اور ان کا دارالمصنفین میں سکون کے ساتھ رہنا مشکل ہوگیا، اس کی تفصیل بڑی طویل اور ناخوش گوار ہے، اور اب دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں، اس لئے اس کا قلم انداز کرنا ہی بہتر ہے۔'' (۱۲)

اس سلسلے میں شاہ صاحب نے ''مکتوبات سلیمانی'' کے مقدمہ سے ایک ادھورا اقتباس نقل کیا ہے جس سے واقعات کا صحیح پس منظر سامنے نہیں آتا، انھوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی کے

یہ جملے نقل کیے ہیں۔

''مولانا مسعود علی ندوی کا معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے، آخر کے کئی برسوں میں سید صاحب کو ان سے بہت زیادہ رنجش ہوگئی تھی، اور آخر وقت تک قائم رہی، اس مجموعہ کے آخری دو مراسلے تو گویا بالکل استغاثے یا عرضی دعویٰ ہیں۔'' (۱۳)

تصویر کا صحیح رخ پیش کرنے کے لئے اگر شاہ صاحب اپنے قارئین کو مولانا عبدالماجد دریابادی کے پورے اقتباس سے آگاہ کراتے تو اندازہ ہوجاتا کہ مولانا عبدالماجد مرحوم کے نزدیک مولانا مسعود علی ندوی اس ''خطا'' کے کس حد تک ذمہ دار تھے، بہرحال مولانا عبدالماجد دریابادی کی پوری عبارت اس طرح ہے:

''مولوی مسعود علی صاحب ندوی کا معاملہ البتہ ذرا ٹیڑھا ہے، آخر کے کئی برسوں میں سید صاحب کو ان سے رنجش بہت زیادہ پیدا ہوگئی تھی، اور بالکل آخر وقت تک قائم رہی، اس مجموعہ کے آخری دو مراسلے تو گویا بالکل استغاثے یا عرضی دعوے ہیں، اس سلسلے میں ناظرین سے درخواست ہے کہ وہ موصوف کے حق میں رائے زیادہ سخت نہ قائم کریں، ان کی صفائی میں جو کچھ کہا جاسکتا تھا اسے مختصراً حاشیوں میں پیش کردیا گیا ہے، اگر ایسے تذکروں کو سرے سے نظرانداز کردیا جاتا تو یہ تاریخ اور حقیقت نگاری پر ایک ظلم ہوتا ہے، سید صاحب مظلوم یقیناً تھے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا، کہ فریق مقابل ظالم بھی اسی درجہ کا ہو، بالکل ایسے ہی جیسے کسی روایت کے تمام تر غلط ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ راوی بھی وضاع وکذاب ہو، دنیا کے معاملات میں بڑا دخل سہو ونسیان، غیر ارادی غلط فہمیوں اور قصد واختیار بلکہ علم وشعور سے بھی، باہر حوادث تکوینی اور ترتیب واقعات کو ہوتا ہے اور فطرت بشری کے ان تاثرات سے بہترین خلائق یعنی حضرات صحابہ تک کا مزاج مستثنیٰ نہ رکھا گیا، سید صاحب کی وفات کے بعد ہی مولوی صاحب نے تلافی مافات کی پوری کوشش کی، اور عجب نہیں کہ یہ کوشش عنداللہ بالکل مقبول ہوگئی ہو۔'' (۱۴)

اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ سید صاحب اور مسعود علی ندوی مرحوم میں اختلاف ہوگیا تھا اس اختلاف کو غرض پسند طبیعتوں نے اور بھی ہوا دی، مکتوبات سلیمانی جلد دوم کے خط نمبر ۲۰۰ کے حاشیے

سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کی شکایتیں مجلس دارالمصنفین کے سامنے پیش کی گئیں اس مجلس کے ایک رکن مولانا مسعود علی ندوی بھی تھے، مجلس نے بشمول ان کے ایک ایسا فیصلہ کیا جس سے سید صاحب کی شکایتیں دور ہو جاتیں مگر کارکنان قضاوقدر کا فیصلہ دوسرا تھا، مجلس کے فیصلے کے نفاذ سے پہلے ہی سید صاحب اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

شاہ صاحب نے دوسری جگہ مولانا مسعود علی ندوی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''مولانا مسعود علی صاحب طالب علمی کے زمانہ کے ساتھی بھی تھے اور شاگرد بھی قیام دارالمصنفین کے بعد سید صاحب اس کے ناظم مقرر ہوئے اور مولوی مسعود علی صاحب مہتمم یا منیجر، اس لئے ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ سے لے کر سید صاحب کے بھوپال اور اس کے بعد پاکستان جانے تک دونوں کا برابر ساتھ رہا، دارالمصنفین کو پروان چڑھانے میں دونوں کا حصہ ہے، سید صاحب اگر اس کی روح تھے، تو مولانا مسعود علی صاحب جسم، سید صاحب کی ذات سے ہندوستان اور بیرون ہند میں دارالمصنفین کی علمی شہرت ہوئی، تو مولانا مسعود علی صاحب نے اس کا مقامی وقار قائم کیا، اور اس کے انتظامی امور کو سنبھالا، غرض ایک مدت تک دونوں دارالمصنفین کے کاموں میں ایک دوسرے کے معاون و مددگار رہے، لیکن آخر میں دونوں کے تعلقات کا خاتمہ بڑے افسوس ناک طریقہ سے ہوا، جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے، ۱۹۶۹ء میں انتقال ہوا، اور دارالمصنفین میں دفن ہوئے۔'' (۱۵)

جب شاہ صاحب اپنے دو بزرگ معاصرین کے ساتھ انصاف نہ کر پائے تو اس بات کی ان سے کیسے امید کی جا سکتی ہے کہ انھوں نے سید صاحب کے دیگر معاصرین کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ انصاف پر مبنی ہوگا۔

ڈاکٹر خورشید نعمانی صاحب نے اپنی کتاب ''دارالمصنفین کی ادبی خدمات'' میں حیات سلیمان پر دو اہم اعتراضات کیے ہیں جو صد فی صد درست ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''[۱] اس حکایت لذیذ کو دراز بھی بنایا جا سکتا تھا، خصوصاً مولانا عبدالسلام ندوی کے متعلق کچھ تفصیل سے لکھنے کی ضرورت تھی، کیونکہ سید صاحب کے بعد دارالمصنفین کے قبیلۂ مجنون کے سب سے اہم فرد وہی تھے۔ (۱۶)

[۲] کتاب کو پڑھتے وقت ایک بات بری طرح کھٹکی وہ یہ کہ غور کرنے پر پتہ چلتا ہے
کہ کہاں سید صاحب کی تحریر ختم ہوئی اور کہاں سے شاہ صاحب کی تحریر شروع ہوئی۔" (۱۷)

اوپر کی سطروں میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ اس بات کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ "حیات سلیمان" اردو کے سوانحی ادب میں کوئی خاص مقام نہیں رکھتی، جہاں تک اس کی زبان کا سوال ہے بلا شبہ یہ شاہ صاحب کی شگفتہ زبان میں مرتب کی گئی ہے، کثرت اقتباسات کے عیب کو اس طرح چھپایا گیا ہے کہ بیشتر جگہوں پر حوالوں کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا ہے، غرض یہ کہ اس کتاب میں شاہ صاحب نہ تو مورخ ہی نظر آتے ہیں نہ خالص سوانح نگار، انھوں نے واقعات کی کھتونی جمع کردی ہے، جو بعد میں اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے ایک خام مواد کا کام دیگی۔

☆☆☆

حواشی:

(۱) شاہ معین الدین احمد ندوی، حیات سلیمان، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۷۳ء، ص ۴، ۵۔

(۲) شاہ معین الدین احمد ندوی، حیات سلیمان، ص ۶

(۳) شاہ معین الدین احمد ندوی، حیات سلیمان، ص ۳۰۱

(۴) شاہ معین الدین احمد ندوی، حیات سلیمان، ص ۲۶۲، ۲۶۱۔

(۵) مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۴۴۶

(۶) مکاتیب شبلی، حصہ اول، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۶۶ء ص ۲۴۲۔

(۷) مکاتیب شبلی، حصہ اول، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۶۶ء ص ۲۴۴

(۸) مکاتیب شبلی، حصہ اول، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۶۶ء ص ۲۳۰۔

(۹) مولانا عبدالسلام ندوی کی یاد میں، کبیر احمد جائسی، شبلی نیشنل کالج میگزین، ۱۹۵۸ء، ص ۳۰، ۲۹۔

(۱۰) مولانا عبدالسلام ندوی کی یاد میں، کبیر احمد جائسی، شبلی نیشنل کالج میگزین، ۱۹۵۸ء، ص ۳۰۔

(۱۱) معارف ۱۹۳۵ء بحوالہ مولانا عبدالسلام ندوی کی یاد میں کبیر احمد جائسی، ص ۵۳۔

(۱۲) شاہ معین الدین احمد ندوی، حیات سلیمان، ص ۵۶۹، ۵۶۸۔

(۱۳) شاہ معین الدین احمد ندوی، حیات سلیمان، ص ۵۷۰، ۵۶۹۔

(۱۴) عبدالماجد دریابادی، مکتوبات سلیمانی، جلد دوم، ناشر صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ، ۱۹۶۷ء، ص ۶، ۵۔

(۱۵) شاہ معین الدین احمد ندوی، حیات سلیمان، ص ۲۶۱۔

(۱۶) ڈاکٹر خورشید نعمانی، دارالمصنفین کی ادبی خدمات، رحیمی پریس بمبئی، اکتوبر ۱۹۷۷ء، ص ۱۷۳۔

(۱۷) ڈاکٹر خورشید نعمانی، دارالمصنفین کی ادبی خدمات، ص ۱۷۵۔

☆☆☆

غالب مدح وقدح کی روشنی میں

غالب ہمارے ان شاعروں میں ہیں جن کے بارے میں ان کے عنفوان شباب ہی سے لکھا جارہا ہے(۱) اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے، غالب کی اردو اور فارسی شاعری اور نثر نگاری کے بارے میں مستقل ضخیم کتابیں بھی لکھی گئی ہیں اور مقالے بھی، ان کی شخصیت، شاعری، نثر نگاری، ماحول اور معاصرین کے متعلق شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جس پر کچھ اظہار خیال نہ کیا گیا ہو، جب اس طرح کے موضوعات اپنی تازگی کھونے لگے تو جدت پسند طبیعتوں نے ان کی شخصیت، شاعری اور نثر نگاری کا نفسیاتی اور عمرانی مطالعہ کرنا شروع کیا اور ایسے ایسے نتائج اخذ کیے کہ اگر غالب زندہ ہوتے تو ان کو پڑھ کر اپنا سینہ پیٹے بغیر نہ رہتے، بہر حال مطالعۂ غالب کے سلسلے میں اب تک جو تحریریں معرض وجود میں آئی ہیں وہ دو طرح کی ہیں، ایک تو وہ ہیں جن میں غالب کی تعریف ہی نہیں بلکہ ان کو فوق الفطرت ہستی بنا کر پیش کیا گیا ہے اور ان کی بشری کمیوں، خامیوں اور کجیوں کا نقشہ ایسے فلسفیانہ انداز میں کھینچا گیا ہے کہ وہ بھی ان کے محاسن معلوم ہونے لگے، دوسری طرح کی تحریریں وہ ہیں جن میں غالب کی شخصیت، شاعری و نثر نگاری سب ہی کی تخفیف کی گئی ہے اور ہر لحاظ سے ان کو قدرسوم کا حامل قرار دینے کی مکمل سعی کی گئی ہے، دارالمصنفین کے مرحوم ناظم سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے اپنی کتاب ''غالب مدح وقدح کی روشنی میں'' کی دو جلدوں میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ مذکورہ بالا دونوں نوع کی تحریروں کا ایک ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے لاکھوں صفحات پر محیط مواد کو جمع کردیں، درج ذیل سطور میں ان کی اس کاوش کا ایک سرسری جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

آٹھ سو انتالیس صفحات پر پھیلی ہوئی اس کتاب کو لکھنے کے لئے صباح الدین صاحب نے غالب سے متعلق ہر اہم کتاب کا بڑی غائر نظروں سے مطالعہ کیا، پھر ان کے خاص خاص نکات نکال کر ان پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے قاری کو کتاب یا مقالہ کے بارے میں مکمل

معلومات فراہم کردی ہیں، اور جہاں جہاں انھوں نے ضروری سمجھا ہے مصنف کے اقتباسات بھی اپنی بات کی تائید وتوثیق میں پیش کرتے چلے گئے ہیں، اس کتاب میں ان کی حیثیت صرف ایک جامع کی نہیں بلکہ بعض بعض مقامات پر انھوں نے اپنی رائے کا بھی اظہار کرتے ہوئے مصنف سے اتفاق یا اختلاف کیا ہے، جس کی وجہ سے اس کتاب میں تنقیدی عناصر کی ہلکی پھلکی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے، ہزاروں بلکہ لاکھوں صفحات کا دیدہ ریزی سے پڑھنا، ان کا خلاصہ کرنا اور اس کو مرتب انداز سے پیش کرنا ہی کچھ کم نہ تھا، مگر انھوں نے اپنے خیالات کا اس میں اضافہ کرکے اس کتاب کو دوآتشہ بنادیا ہے، صرف اسی ایک کتاب کے مطالعے سے ایک عام قاری کو اس بات کا علم ہوجاتا ہے کہ غالب کی تحسین اور تنقیص میں کیسی کیسی تحریریں معرض وجود میں آچکی ہیں اور ان تحریروں کے مصنفین کون کون حضرات تھے اور ان کا تعلق کس عہد سے تھا، ان تمام چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے قاری اس بات کا بخوبی اندازہ لگاسکتا ہے کہ غالب کی ستائش کس زمانے میں زیادہ ہوئی اور اس کے اسباب کیا تھے، اسی طرح وہ یہ بھی جان سکتا ہے کہ کن کن حضرات کے ذریعے ان کی شخصیت اور کارناموں پر تنقید کی چنگاریاں برسائی گئیں اور اس کے پیچھے کون کون سے عوامل کارفرما تھے؟

صباح الدین صاحب نے ہر کتاب اور مقالے کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے تفصیل یا اختصار کے ساتھ اس کا تعارف کرایا ہے، یادگار غالب، شعرالہند، اور شیخ اکرام کا غالب نامہ وہ کتابیں ہیں جن پر انھوں نے خاصی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، ان میں بھی غالب نامہ کا بہت ہی بھرپور مطالعہ کیا ہے اور اس کا تعارف کرانے کے ساتھ ساتھ انھوں نے شیخ اکرام کے بہت سے افکار وخیالات سے اختلاف کیا ہے، صباح الدین صاحب نے جس شدومد کے ساتھ شیخ اکرام سے اختلاف کیا ہے اس شدومد سے کسی دوسرے مصنف سے نہیں کیا ہے، انھوں نے بڑی دیدہ ریزی سے غالب نامہ کے تمام ایڈیشنوں کا مطالعہ کیا اور ہر ایڈیشن میں جو ترمیم واضافہ ہوتا رہا اس پر خاص طور سے نظر رکھی ہے اور اس ترمیم واضافہ کو انھوں نے اس انداز سے پیش کیا ہے جیسے کہ یہ کوئی خامی ہو۔ (۲) اس مقام پر ہم صباح الدین صاحب کی رائے سے اتفاق نہ کرتے ہوئے یہ کہنے کی جرأت کریں گے کہ اگر شیخ اکرام کی فکر جامد ہوتی تو وہ کبھی بھی غالب نامہ کے مختلف ایڈیشنوں میں ترمیم و اضافے نہ کرتے لیکن چونکہ ان کی فکر ارتقاء کی راہوں پر گامزن تھی اس لئے ان کی بعض رایوں میں

تبدیلی آتی رہی اور وہ ایک ایماندار ناقد کی حیثیت سے ان تبدیلیوں سے اپنے قاری کو بھی روشناس کراتے رہے، صباح الدین صاحب کو ایک ناقد کی حیثیت سے اس بات پر روشنی ڈالنی چاہئے تھی کہ شیخ اکرام نے اپنی رایوں میں جو تبدیلیاں کی ہیں وہ کیوں کی ہیں اور انھوں نے غالب کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں جو آخری رائے ظاہر کی ہے اس کی قدر و قیمت کیا ہے؟ اس ''کیوں'' اور ''کیا'' کا جواب اگر وہ دے پاتے تو ان کی یہ تنقید واقعی اور حقیقی تنقید میں تبدیل ہو سکتی تھی۔

شیخ اکرام نے غالب پر زیر بحث کتاب لکھتے وقت یہ بات مدنظر رکھی تھی کہ ڈاکٹر عبداللطیف نے جو کڑے معیار اپنی کتاب میں متعین کیے ہیں ان پر بھی ان کی کتاب پوری اترے، انھوں نے یہ بات صرف اپنے ذہن میں نہیں رکھی بلکہ مقدمہ میں بھی اس کا برملا اظہار کیا ہے، اس سلسلے میں شیخ اکرام کے اصل الفاظ یہ ہیں:

> ''میں نے محسوس کیا کہ غالب کے متعلق ایک ایسی کتاب لکھی جائے جو ڈاکٹر عبداللطیف کے کڑے معیار پر بھی پوری اترے، اور جس میں مولانا حالی کی میانہ روی اور ان کے مقدمہ دیوان کی بالغ نظری کی پیروی بھی ہو، یادگار غالب مجھے بہت پسند تھی، لیکن یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہ تھا کہ اس میں سوانحی تسلسل قریباً مفقود تھا، اور شاعر کے کئی اہم واقعات زندگی کے متعلق مصنف کا بیان نہایت سرسری اور سنہ وقوع یا اس طرح کی ضروری تفصیلات سے عاری تھا۔'' (۳)

صباح الدین صاحب نے ڈاکٹر عبداللطیف کے قائم کردہ معیاروں کا بڑی عرق ریزی سے مطالعہ کر کے شیخ اکرام کے افکار و آراء کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور جو نتیجہ نکالا ہے وہ انھیں کے الفاظ میں یہ ہے:

> ''اگر اکرام صاحب نے اپنی کتاب واقعی ڈاکٹر عبداللطیف صاحب کے ان کڑے اصولوں کے مطابق لکھی ہے، تو پھر دیکھنا یہ ہے کہ ان کی کتاب اس معیار پر پوری اترتی ہے کہ نہیں، ان کی کتاب میں غالب کے سوانح حیات سو صفحے میں لکھے گئے ہیں، لیکن صرف دو تین جگہوں کے سوا کہیں غالب کی سرگذشت حیات کو ان کے کلام سے مربوط و متعلق کر کے نہیں دکھایا گیا ہے، اور نہ اس کا تجزیہ کہیں کیا گیا ہے کہ غالب کی زندگی کے ہر واقعہ

میں جو مفہوم اور معانی پوشیدہ تھے، ان کا اثر ان کے ذہنی نمو اور ارتقا پر کس طرح پڑا اگر میرا یہ لکھنا صحیح ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ڈاکٹر عبداللطیف کے گڑھے اصولوں پر اکرام صاحب نے غالب کے سوانح حیات مرتب نہیں کیے۔'' (۴)

شیخ اکرام سے اس اختلاف کے باوجود جب وہ غالب نامہ اور یادگار غالب کا تقابلی مقابلہ کرتے ہیں تو بعض بعض جگہوں پر یہ کہنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس باب میں انھوں نے مولانا حالی سے زیادہ مواد پیش کیا ہے، صباح الدین صاحب کے اس اعتراف حقیقت سے یہ بات تو مسلم ہو جاتی ہے کہ ان کی تصنیف ''حالی والی'' میانہ روی کی حامل ہے اگر چہ ان کو اس سے بہت سے اختلافات بھی ہیں، بہر حال صباح الدین صاحب نے شیخ اکرام کی کتاب پر اٹھتر صفحات کا تبصرہ لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ غالبیات کے موضوع پر شیخ اکرام کی تحریر ان کے نزدیک سب سے اہم ہے، اگر وہ اس کو اتنا اہم نہ سمجھتے تو اس کی ہر ہر بات کا تجزیہ کرنے اور جواب دینے کے لئے اتنی کد و کاوش نہ کرتے، ان کے افکار و نظریات سے شدید اختلاف کرنے کے باوجود انھوں نے ان کے ترتیب دیوان غالب کو پسند کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''البتہ اکرام صاحب کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے غالب کے دیوان کی ترتیب سنہ وار کی ہے، جس سے غالب کے ارتقائی ذہن کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، غالب نامہ کے پہلے ایڈیشن میں تو صرف اردو کا کلام تھا، لیکن ارمغان غالب میں اردو کلام کے ساتھ فارسی کلام سنہ وار ترتیب کے ساتھ درج ہے، اس ترتیب میں اکرام صاحب نے جو محنت، تلاش اور تحقیق کی ہے، وہ ہر طرح تعریف و تحسین کی مستحق ہے، گو انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ دیوان غالب کی تاریخی تدوین میں سب سے پہلا قدم مفتی انوار الحق نے اٹھایا جنھوں نے نسخہ حمیدیہ کی اشاعت کے بعد غالب کے وہ اشعار جو پچیس برس کی عمر سے پہلے لکھے گئے تھے، بعد کے اشعار سے جدا کر کے ترتیب دیے، مفتی صاحب نے یہ ترتیب صحیح عالمانہ ذوق سے متاثر ہو کر کی ہے۔'' (۵) (ارمغان غالب، ص۹)

''پروفیسر کلیم الدین احمد اور غالب''، رشید احمد صدیقی اور غالب''، ''قاضی عبدالودود اور غالب'' اور ''نیاز فتحپوری اور غالب'' کے عنوانات سے صباح الدین صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ اتنا

طویل تو نہیں ہے جتنا کہ ''اکرام اور غالب'' والا باب ہے، مگر ان ابواب میں ان کی پوری کدوکاوش نمایاں ہے، ''قاضی عبدالودود اور غالب'' کے باب میں انھوں نے صرف قاضی صاحب ہی کی تحریروں کو اپنے پیش نظر نہیں رکھا ہے بلکہ شوکت سبزواری مرحوم نے قاضی صاحب کی تحریروں پر جو اعتراضات کئے ہیں ان سب کو بھی انھوں نے اپنے مطالعے کا ہدف بنایا ہے، یہ باب لکھا تو بڑی محنت سے گیا ہے مگر ہم کو اس میں یہ کمی محسوس ہوتی ہے کہ انھوں نے جس طرح شیخ اکرام کے افکار و خیالات پر رائے زنی کی ہے اسی طرح قاضی صاحب اور مرحوم شوکت سبزواری کے افکار وخیالات کا جائزہ نہیں لیا ہے، اس مقام پر ایک عام قاری یہ جاننے کے لئے بیتاب رہتا ہے کہ خود صباح الدین صاحب کی تحقیق کس کے حق میں ہے قاضی صاحب کے یا سبزواری مرحوم کے، مگر وہ اپنی رائے ظاہر کئے بغیر اس وادیٔ پرخار سے اپنا دامن بچائے ہوئے گزر جاتے ہیں۔

اس کتاب کا آخری باب غالب کے صدسالہ یادگار سمینار پر ہے جو ہمارے نزدیک تشنہ ہے، اس باب میں صباح الدین صاحب نے ان تمام مقالات کی فہرست تو ضرور دیدی ہے جو ۱۷رفروری سے ۱۹رفروری تک ۱۹۶۹ء میں دہلی میں پڑھے گئے تھے، ہم کو امید تھی کہ وہ اس یادگار سمینار پر لکھتے ہوئے کم از کم بیرونی ملکوں کے مندوبین کے مقالوں کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے کوئی محاکمہ کریں گے اور یہ دکھلانے کی کوشش کریں گے کہ دوسرے ملکوں کے ناقدین غالب کی شخصیت و شاعری اور نثر نگاری کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ اور ان کی رائے ہم ہندوستانیوں کے لئے کس حد تک قابل قبول ہیں، علاوہ بریں ان بیرونی عالموں اور ناقدوں کے نزدیک غالب کی اہمیت کن کن باتوں میں مضمر ہے اور ان کے نزدیک عصر حاضر میں غالب کی معنویت کیا ہے؟ اگر ان تمام سوالوں سے صباح الدین صاحب بحث کرتے تو ان کا یہ باب بہت وقیع ہو جاتا، موجودہ صورت میں تو یہ صرف ان تمام مقالات کا ایک تعارف کراتا ہے جو غالب کے صدسالہ یادگار سمینار میں پڑھے گئے تھے۔

صباح الدین صاحب نے زیر بحث کتاب ۱۹۶۹ء کے بعد لکھی ہے اس لئے اگر وہ اس کتاب میں ان تمام خاص نمبروں پر بھی ایک ناقدانہ نظر ڈال لیتے جو غالب صدی کے موقع پر شائع ہوئے تھے تو ان کی کتاب اور بھرپور ہو جاتی، نقوش لاہور نے تو غالب پر دو ضخیم نمبر شائع کئے تھے،

علاوہ بریں ہندوستان سے علی گڑھ میگزین ،فکر ونظر علی گڑھ، اردو ادب، علی گڑھ، آج کل، دہلی، تحریک، دہلی وغیرہ نے بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق خاص نمبر شائع کئے، اگر ان تمام نمبروں کا بھی ناقدانہ جائزہ ایک باب میں لے لیا جاتا تو قاری کے لئے زیادہ مفید ہوتا۔

ان باتوں کے باوجود صباح الدین صاحب کی محنت اور دیدہ ریزی قابل داد ہے جس کی بناء پر اردو دنیا کے ہاتھوں میں ایک ایسی کتاب آ گئی جس میں غالب موافق اور غالب مخالف تحریروں کا ایک خاصہ بڑا سرمایہ محفوظ ہو گیا ہے، اس سرمایے پر نظر ڈالتے ہوئے غالب پر مزید کام کئے جا سکتے ہیں، یہی بات اس کتاب کو اہم اور بامعنی بناتی ہے، جہاں تک صباح الدین صاحب کے طرز تحریر کا سوال ہے اس کے بارے میں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ ان کی تمام تنقیدی اور علمی تحریریں ''دبستان شبلی'' کی نمایندگی کرتی ہیں، مگر ان کا کمال یہ ہے کہ ان کی تحریریں نہ تو شبلی کی تحریروں کا چربہ معلوم ہوتی ہیں اور نہ ہی سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کی تحریروں کا، بلکہ وہ اپنی ایک الگ شان رکھتی ہیں، ان کی زبان میں برجستگی بھی ہے اور روانی بھی، کہیں کہیں وہ مناسبات لفظی سے اپنی تحریروں میں ایک دلکشی اور حسن پیدا کر دیتے ہیں اور کبھی اشعار کا ایسا برجستہ استعمال کر جاتے ہیں جیسے یہ شعر اسی موقع کے لئے لکھا گیا ہو، عمر کے آخری ایام میں ان کی جو تصانیف منظر عام پر آئیں ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا جسم جیسے جیسے بوڑھا ہوتا جا رہا تھا ویسے ویسے ان کا قلم جوان سے جوان تر ہوتا جا رہا تھا اس دور میں وہ خاصے زود نویس ہو گئے تھے اور سفرناموں سے لے کر مختلف علمی موضوعات پر مستقل کچھ نہ کچھ لکھا کرتے، مگر اس زودنویسی کی وجہ سے ان کی زبان میں کوئی نقص یا کمی واقع نہیں ہونے پائی، وہ اپنی تحریر کی دلکشی اور رعنائی کو ہر حال میں برقرار رکھنے میں کامیاب رہے، یہی زیر بحث کتاب کا سب سے بڑا وصف ہے کہ اس میں صباح الدین صاحب کے انداز بیان کی شان دلبرانہ ہر جگہ نمایاں ہے۔

☆☆☆

حواشی:

(۱) سید صباح الدین عبدالرحمٰن، غالب مدح وقدح کی روشنی میں، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، طبع اول، جلداول، ۱۹۷۷ء، ص۲۔

(۲) سید صباح الدین عبدالرحمٰن، غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد دوم، ص۱۰۸۔

(۳) سید صباح الدین عبدالرحمٰن، غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد دوم، ص۳۷، ۳۶

(۴) سید صباح الدین عبدالرحمٰن، غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد دوم، دارالمصنفین اعظم گڑھ طبع اول ۱۹۷۹ء، ص۳۸۔

(۵) سید صباح الدین عبدالرحمٰن، غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد دوم، ص۱۲۲۔

☆☆☆

معارف

۱۸ رنومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی اپنے بہت سے علمی کاموں کو ادھورا چھوڑ کر اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے، ان کے انتقال کے بعد ان کے شاگردوں نے ''اخوان الصفا'' کے نام سے ایک جماعت بنائی جس کے ارکان حسب ذیل تھے: (۱)

۱- مولانا حمید الدین فراہی (م ۱۹۳۰ء) صدر مجلس
۲- مولانا سید سلیمان ندوی (م ۱۹۵۳ء) ناظم
۳- مولانا عبدالسلام ندوی (م ۱۹۵۶ء) رکن
۴- مولوی مسعود علی ندوی (م ۱۹۶۷ء) رکن
۵- مولوی شبلی متکلم ندوی (۲) (م ۱۹۷۳ء) رکن

اس اخوان الصفا نے علامہ شبلی کے خوابوں کے مطابق اعظم گڑھ میں دارالمصنّفین کے باقاعدہ قیام کا بیڑا اٹھایا اور جولائی ۱۹۱۵ء میں اس کی رجسٹری بھی کرائی گئی، جب دارالمصنّفین کا کام ذرا چل نکلا تو اس کے ترجمان کی ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ یہ طے پایا کہ معارف کے نام سے اس کا ماہانہ ترجمان شائع کیا جائے، جب دارالمصنّفین کے اپنے پریس نے معارف پریس کے نام سے کام کرنا شروع کیا تو جولائی ۱۹۱۶ء میں معارف کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا، اس دن سے آج تک یہ ماہنامہ باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، اردو زبان کا شاید ہی کوئی رسالہ اس کی طویل العمری کا مقابلہ کر سکے۔

معارف کی اشاعت سے قبل سرسید کے تہذیب الاخلاق سے لے کر خواجہ غلام الثقلین کے عصر جدید تک متعدد رسائل شائع ہو چکے تھے اور اب تک ہو رہے ہیں، مگر معارف نے اپنی منزل مقصود سب سے الگ متعین کی، سید صاحب نے معارف کے شمارہ میں اس کے جو مقاصد بیان کئے ہیں وہ معارف کی منزل مقصود پر بڑی اچھی روشنی ڈالتے ہیں:

"فلسفۂ حال کے اصول اور اس کا معتد بہ حصہ پبلک میں لایا جائے، عقائد اسلام کو دلائل عقلی سے ثابت کیا جائے، علوم قدیمہ کو جدید طرز پر از سر نو ترتیب دیا جائے، علوم اسلامی کی تاریخ لکھی جائے اور بتایا جائے کہ اصل حصہ کہاں تک تھا اور مسلمانوں نے اس پر کیا اضافہ کیا، علوم مذہبی کی تدوین اور اس کے عہد بہ عہد کی ترقیوں کی تاریخ ترتیب دی جائے، اکابر سلف کی سوانح عمریاں لکھی جائیں، جن میں زیادہ تر ان کے مجتہدات اور ایجادات سے بحث ہو، عربی زبان کی نادر الفن اور کم یاب کتابوں پر ریویو لکھا جائے اور دیکھا جائے کہ ان خزانوں میں ہمارے اسلاف نے کیا کیا زر و جواہر امانت رکھے ہیں اور سب سے آخر لیکن سب سے اول یہ کہ قرآن مجید کے متعلق عقلی، ادبی، تاریخی، تمدنی اور اخلاقی مباحث جو پیدا ہو گئے ہیں، ان پر محققانہ مضامین شائع کئے جائیں۔"(۳)

اس مقصد کو سامنے رکھ کر معارف نکلنا شروع ہوا، معارف کی اشاعت کی تاریخ کو ہم تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں، اس کا پہلا دور اس زمانے میں ختم ہوتا ہے، جب سید صاحب جیتے جی اس کی ادارت سے دست کش ہوئے، دوسرا دور شاہ معین الدین احمد ندوی کی وفات پر اور تیسرا دور سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی ادات پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے دور ادارت میں معارف اپنے قائم کردہ معیار پر قائم رہا، معارف کی خوش نصیبی یہ تھی کہ اس زمانے کا ہر بڑا اور صاحب طرز ادیب اور شاعر اس کی قلمی معاونت کرتا، اس زمانے کے رفقائے دارالمصنفین بھی ایسے تھے کہ اگر کوئی شخص بھی معارف سے قلمی تعاون نہ کرتا تو بھی یہ حضرات اپنے زور قلم سے پورا رسالہ مرتب کر سکتے تھے، سید صاحب کے زمانۂ ادارت میں جن شاعروں کا کلام معارف میں شائع ہوتا ان میں مولانا محمد علی جوہر، علامہ اقبال سہیل، مولانا آزاد سبحانی، ڈاکٹر علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی، اصغر گونڈوی، مولانا عبدالسلام ندوی، روش صدیقی، فراق گورکھپوری، حسرت موہانی، فانی بدایونی، جگر مرادآبادی جیسے بڑے اور اہم شاعروں کے نام شامل ہیں، اس زمانے کے معارف میں جس کتاب پر بھی تبصرہ شائع ہوتا وہ واقعی اور بھرپور تبصرہ ہوتا، اگر کسی کتاب کی تعریف و توصیف معارف میں شائع ہو جاتی تو ملک کا پڑھا لکھا طبقہ اس کتاب کو پڑھنے کے لئے بیتاب ہو جاتا، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک کا آغاز ہو جانے کے

باوجود معارف اپنی ڈگر پر چلتا رہا اور اس کا حلقہ سمٹنے نہ پایا، تقسیم ہند کا حادثہ سید صاحب کی نگاہوں کے سامنے سے گزرا مگر انھوں نے معارف کو تقسیم کے زخموں سے بچائے رکھا۔

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے پاکستان چلے جانے کے بعد شاہ معین الدین احمد ندوی صاحب معارف کے ایڈیٹر اور دارالمصنّفین کے ناظم علمی مقرر ہوئے، مولوی مسعود علی ندوی صاحب اپنی پرانی جگہ برقرار رہے، ان کا عہدہ ناظم عملی کا تھا، دفتر کا اہتمام وانصرام، پریس، تنخواہوں کی ادائیگی اور اس طرح کے سارے انتظامی کام ان کے ذمہ تھے، مولانا مسعود علی ندوی اور سید سلیمان ندوی کے درمیان عمر کے آخری حصے میں جو شدید اختلافات پیدا ہو گئے تھے ان کا گہرا اثر سید صاحب کے شاگردوں پر بھی تھا اور ہر شخص مولانا مسعود علی ندوی کا ناقد بنا ہوا تھا، صرف مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم دارالمصنّفین کی بقا کے لئے مولوی مسعود علی ندوی کے وجود کو لازمی سمجھتے تھے، اس اندرونی کشاکش اور کشمکش کا اثر دارالمصنّفین پر یہ پڑا کہ رفقا کی توجہ اور دلچسپی میں کمی آئی اور بہت سے ادھورے کام ادھورے ہی رہ گئے، آپسی اختلاف کی وجہ سے شاہ صاحب کے دور نظامت میں سب سے پہلے مولوی ریاست علی ندوی صاحب الگ ہوئے، پھر ۱۹۶۸ء میں مولوی مجیب اللہ ندوی صاحب بھی بزور قوت سبکدوش کر دیے گئے، ۱۹۵۷ء کے بعد ہی سے مولوی مسعود علی ندوی صاحب کی صحت خراب رہنے لگی تھی، پھر وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے، ان کی معذوری کے زمانے میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے دارالمصنّفین کے عملی کاموں کو دیکھنا شروع کیا، وہ دارالمصنّفین کے باقاعدہ ملازم ہونے کے باوجود شبلی پوسٹ گریجویٹ کالج میں بھی ملازمت کرتے مگر اسی کے ساتھ تندہی سے ضخیم تر کتابوں کی تالیف میں لگے رہتے، شاہ صاحب نے اپنے دور نظامت میں اپنی دو کتابیں ''دین رحمت'' اور حیات سلیمان'' شائع کیں، ورنہ وہ اپنا سارا وقت معارف کے مضامین کو درست کرنے میں صرف کرتے، شاہ صاحب کے دورِ ادارت میں معارف کی زبان اپنی جگہ برقرار رہی لیکن مضامین کا تنوع ختم ہونے لگا، اس کی وجہ یہ تھی کہ معارف کے پرانے مضمون نگار ایک ایک کر کے اللہ کو پیارے ہوتے جا رہے تھے، پروفیسر نذیر احمد صاحب، ڈاکٹر عشرت حسین انور، کلب علی خاں، خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، شبیر احمد خاں غوری جیسے صاحبان فکر ونظر کے مقالات سے بڑی حد تک معارف کا پرانا معیار برقرار رہا، مگر ''باب التقریظ والانتقاد'' مفقود

ہونے لگا، اسی طرح معارف کے تبصروں میں بھی پرانی بات نہ رہی، اس دور میں بعض ایسے تبصرے بھی شائع ہوئے ہیں جن کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ دوسرے رسالوں کے تبصروں کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں، ''ادبیات'' کا جو عنوان سید صاحب کے زمانے سے معارف میں چلا آرہا تھا وہ اگرچہ باقی رہا مگر روش صدیقی، حبیب احمد صدیقی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور یحییٰ اعظمی کے علاوہ قابل ذکر شاعروں کا کلام کم ہی معارف میں شائع ہوتا، ان تمام باتوں کے باوجود شاہ صاحب نے معارف کی زبان کے معیار کو قائم رکھا جو ان کا ایک کارنامہ ہے۔

شاہ صاحب کے انتقال کے بعد مولانا عبدالسلام قدوائی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کی مشترکہ ادارت میں معارف نکلنا شروع ہوا، مولانا عبدالسلام قدوائی تقریباً پانچ برسوں تک دارالمصنفین کی خدمت کر پائے، ان کے انتقال کے بعد سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب بلاشرکت غیرے دارالمصنفین کے علمی اور عملی ناظم اور معارف کے ایڈیٹر بنے، صباح الدین صاحب کے دور ادارت میں معارف کے مقالہ نگاروں کا حلقہ مزید تنگ ہوا، اس زمانے میں ''باب التقریظ والانتقاد'' کے عنوان سے کم ہی تحریریں شائع ہوتیں، اخبار علمیہ کا عنوان شاہ صاحب کے زمانے میں ہی ترک ہو چکا تھا، مطبوعات جدیدہ کا عنوان اپنی جگہ برقرار رہا مگر وہ اپنی تازگی اور شگفتگی سے محروم ہو گیا، معارف جیسا علمی رسالہ اب سفرناموں سے بھرا رہنے لگا، پروفیسر نذیر احمد صاحب، ڈاکٹر محمد ریاض، مولانا عبدالسلام خان، ڈاکٹر سید نعیم الدین، خواجہ عبدالحمید یزدانی، محمد ایوب قادری اور رفقائے دارالمصنفین میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی، عبیداللہ کوٹی، مولانا عمیر الصدیق ندوی صاحب اور خود سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کی تحریروں سے معارف کے معیار کا بھرم قائم رہا، حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ اپنے گنبد بے در سے نکل کر زمانے کے چیلنج کا مقابلہ کیا جاتا، معارف کی معنوی ہی نہیں صوری کشش میں بھی اضافہ کیا جاتا، عصر حاضر کے ایسے مسائل جن سے آج کے ہندوستانی مسلمان دوچار ہیں معارف ان پر تحقیقی و علمی کام کر کے مشعل راہ بنتا، تاکہ شبلی، سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کے مشن کی تکمیل کی نئی راہیں ہموار ہوتیں۔

معارف نے اپنے دور اول میں جو مقالات شائع کیے وہ قدر اول کے حامل تھے، یہ مقالات قرآن، حدیث، تفسیر، اصول تفسیر، فقہ، فتاویٰ، سیر و سوانح، آثار صحابہ جیسے موضوعات کا

احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ فلسفہ، منطق، ہیئت، طب جیسے عقلی علوم کا بھی احاطہ کرتے ہیں، اس کے لکھنے والے زیادہ تر وہ اصحاب قلم ہوتے جو قدیم علوم پر مکمل دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ سے بھی واقف ہوتے، علاوہ بریں عربی، فارسی اور اردو وادبیات کے موضوعات پر بھی مستقل مقالے شائع کئے جاتے، رسالہ کے تنوع کو قائم رکھنے کے لئے اخبار علمیہ اور آثار ادبیہ کے بھی مستقل کالم ہوتے، اخبار علمیہ بڑی محنت سے ترتیب دیا جاتا جو ایک پڑھے لکھے قاری کے لئے علمی وادبی ذوق کی تسکین کے لئے کافی ہوتا۔

کسی اخبار یا رسالے کو مقالات کے علاوہ جو چیز سب سے زیادہ دلچسپ اور معنی خیز بناتی ہے وہ اخبار اور رسالوں کا اداریہ ہوتا ہے، معارف نے رسم ورہ عام کی پابندی نہیں کی، یعنی مسلسل اور مربوط اداریوں کو اس کے صفحات میں شامل نہیں کیا گیا بلکہ اس کی جگہ مسائل حاضرہ سے متعلق چھوٹے چھوٹے اداریے "شذرات" کے نام سے تحریر کئے جاتے، سید سلیمان ندوی مرحوم کے شذرات علم وادب کا بھی خزانہ ہیں اور مسائل حاضرہ کے ذکر کا بھی، ان شذرات میں بھی سید صاحب کی انشا پردازی اپنی جگہ برقرار رہتی ہے، افسوس ہے کہ ہم اس کتاب میں ان کے سارے شذرات کا جائزہ نہ لے سکیں گے، تاہم اس موضوع پر اتنا مواد ضرور فراہم کر دیا جائے گا جس سے ان کے شذرات کی قدر و قیمت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکے۔

ہندوستان کی شرح خواندگی پر اظہار خیال کرتے ہوئے سید صاحب نے برطانوی استعمار پر ۱۹۲۰ء میں جو چوٹ کی ہے وہ ادب وانشاء کا بہترین نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی بڑی اچھی روشنی ڈالتا ہے کہ آزادئ ہند سے ستائیس سال قبل ہمارے عمائدین کس انداز سے سوچ رہے تھے؟ وہ تحریر فرماتے ہیں:

> "روس کی مملکت جب تک زندہ رہی، مغربی تمدن کے عارض کمال پر ایک داغ رہی اور اس کی جہالت، تاریک خیالی وتوحش سے ایک دنیا واقف ہے، ۱۸۸۰ء میں اس کی آبادی میں ۲ء۱ فیصدی بچے زیر تعلیم تھے، اس کے چھبیس ستائیس سال بعد ۶-۷ میں یہ تعداد بڑھ کر ۵ء۴ فیصد تک پہنچ گئی لیکن روشن خیال وعلم دوست برطانیہ کے ظل عاطفت میں نشو ونما پانے والے ہندوستان کی زیر تعلیم آبادی ۲۸ سال کی مدت میں کل ۹ء۱ تک پہنچ سکی

کیا ہندوستان کی شور بختی اس درجہ کو پہنچ گئی کہ یہاں آ کر ظلِ ہما میں بھی سایۂ بوم کی تاثیر پیدا ہوجاتی ہے۔"(۴)

اپریل ۱۹۲۸ء کے معارف میں سید صاحب کے شذرات کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اس وقت مسلمان خطرناک اور نازک دور سے گزر رہے ہیں، ترکی کو جنگ عظیم (اول) میں جو مادی شکست ہوئی تھی اس کو سید صاحب نے اس کی دماغی اور ذہنی شکست بھی قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ ترکی نے یورپ کی تلوار کے سامنے نہیں بلکہ اس کے تمدن کے سامنے سپر ڈال دی ہے، اس کے بعد انھوں نے مصر کا ذکر کیا ہے، جہاں اگرچہ مصری علماء اور عوام جنگ ہارے تو نہیں تھے مگر ان کی شکست کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ سید صاحب نے ان حوادث کا ذکر کرنے کے بعد اپنے شذرہ میں ایک ایسی بات کہی ہے جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہے، وہ فرماتے ہیں:

"صرف اسلامی اخبارات کے مزاح و تمسخر سے اس سنجیدہ انقلاب کا سیلاب نہیں رک سکتا اور نہ فقط ہمارے علماء کی ترش روئی سے جو نشہ ہم پر چھا چکا ہے وہ اتر سکتا ہے، حقیقی متقیوں اور پرہیزگاروں کو چھوڑ کر عام معترض مسلمان جس وقت اس تمدنی و معاشرتی انقلاب پر ماتم کرتا ہے تو وہ خود اپنے نفس کو فریب دے رہا ہوتا ہے، ذرا وہ کہنے اور لکھنے سے پہلے پھر کر اپنے گھر پر خود ایک نظر ڈالے اور خود اپنے خیالات اور اندرونی خواہشوں کا جائزہ لے لے تو اس کو معلوم ہوگا کہ وہ خود اپنی اندرونی مخفی خواہشوں کو دبا دبا کر کہہ رہا ہے، حسن و قبح کے معیار کی نظر بدل چکی اور دل کا پنڈولم اپنی جگہ سے ہٹ چکا ہے اور ہم اور وہ دونوں افراط و تفریط کی بے اعتدالیوں میں گرفتار ہیں، بقول اکبر ؎

ادھر یہ ضد ہے کہ لیمنڈ بھی چھو نہیں سکتے
ادھر یہ ضد ہے کہ ساقی! صراحی مے لا (۵)

اسلام کی اجتماعی زندگی میں علمائے کرام کو انتہائی ارفع و اعلیٰ مقام حاصل ہے، اگر اسلامی معاشرہ زوال پذیر ہو رہا ہو یا غلط سمت سفر پر گامزن ہو تو اس کی اصلاح و رہبری کی سب سے زیادہ ذمہ داری علماء پر ہی عائد ہوتی ہے، سید صاحب خود عالم دین تھے، اپنے زمانے کے طبقۂ علماء کا احتساب کرتے ہوئے جنوری ۱۹۳۰ء کے معارف کے شذرات میں تحریر فرماتے ہیں:

''علماء کی جماعت میں ایسے افراد تمام دوسری جماعتوں کے افراد سے زیادہ ہیں جنھوں نے محض اپنے طرۂ دستار کی بلندی کو اپنے وقار وعظمت کا معیار ٹھہرالیا ہے، وہ نیچے سے لے کر اونچے تک ہر ایک سے اس کے متوقع ہیں کہ وہ ان کی محض ان کے علم کی خاطر تعظیم کرے، حالاں کہ علم بلا عمل نہ دین میں عزت کی چیز ہے اور نہ دنیا میں، ہمیشہ سے یہ ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا کہ جو مخدوم بنا ہے وہ پہلے خادم ہوا ہے، پرانا مقولہ ہے:

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد

علماء اگر مخدوم بننا چاہتے ہیں تو پہلے ان کو خلوص دل کے ساتھ امت کا خادم بننا چاہیے، تعلیم کی اشاعت، علم کی خدمت، دین کی تبلیغ، اخلاق کی تعلیم، عوام کی مدد، بگڑوں کو بنانا، گرتوں کو سنبھالنا، غریبوں کی تسلی، امیروں کی درستی، گمراہوں کی رہنمائی اور بے کسوں کی دستگیری ان کا فرض ہو، اپنا کھانا نہیں، بلکہ بھوکوں کو کھلانا، اپنا پہننا نہیں بلکہ ننگوں کو پہنانا، اپنی فکر نہیں، بلکہ دوسروں کا غم ان کے ہر روز کا کام ہو، یہ ہے دین و دنیا میں ان کے وقار وعظمت کا اصلی معیار۔

شبان وادیٔ ایمن گہے رسد بمراد

کہ چند سال بجان خدمت شعیب کند'' (۶)

معارف کے شذرات کا یہی انداز اس وقت تک قائم رہا جب تک سید صاحب لکھتے رہے، یہ موقع نہیں ہے کہ ہم ان کے شذرات کا تفصیلی جائزہ لے کر علم وادب، مذہب وسیاست کے ہر گوشے پر سید صاحب کی مضبوط گرفت کو واضح کریں، اس لئے ایک اور اقتباس پر اکتفا کرتے ہوئے اس بحث کو ختم کرتے ہیں، جنوری ۱۹۲۶ء کے شذرات میں جاپان کی مذہبی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے عیسائی مورخین کے اس اتہام کا بطلان کیا ہے کہ اسلام نے بزور شمشیر دوسرے مذاہب کو نیست ونابود کیا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:

''عیسائی مورخ مسلمانوں پر یہ الزام لگاتے رہے ہیں کہ انھوں نے تلوار کے زور سے دوسرے مذاہب کو مٹایا ہے، خیر وہ تو عیسائیوں کے بقول تاریکی کا زمانہ تھا لیکن آج تمدن اور تہذیب اور ترقی کی روشنی میں امریکہ کے سپہ سالار اور جاپان کے مختار مطلق نے

اپنے فرمان سے جاپان کے سرکاری مذہب شنتوازم (اسلاف پرستی) کا خاتمہ کر دیا کہ اب نہ وہ جاپان کا سرکاری مذہب رہے گا اور نہ اس کے مندروں پر سرکاری خزانہ سے کوئی رقم خرچ ہوگی، نہ جاپان کا امپور اوس مذہب کا اعلیٰ عہدہ دار اور بزرگوں کا نمائندہ اور خدا کا مظہر سمجھا جائے گا، اس کو کیا کہا جائے گا؟ عجب نہیں کہ امریکہ کی تاریخ میں اس واقعہ کا ذکر آزادی مذاہب کے تحت میں درج ہو اور بتایا جائے کہ امریکہ نے جاپان کو اوہام کی تاریکی اور انسانی پرستش کی ظلمت سے نکال کر اس کے لئے حقیقت کے نور تک پہنچنے کے لئے راستہ صاف کر دیا لیکن اگر مسلمانوں نے دنیا سے شرک وکفر کو مٹانے کے لئے ایسی ہی مجاہدانہ سرگرمیاں دکھائیں تو وہ کیوں موردالزام ہوں۔'' (۷)

معارف کے دوراول کی ایک اہم خصوصیت اس کا ''اخبار علمیہ'' ہے، معارف کا یہ حصہ دوسری زبانوں بشمول انگریزی سے ترجمہ کیا جاتا اور ہر نادر محیرالعقول انکشاف واکتشاف سے قارئین معارف کو روشناس کرایا جاتا، ایک عرصے تک ''اخبار علمیہ'' کے مرتب کا نام شائع نہ ہوتا لیکن انداز تحریر سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سارے بے نام اخبار علمیہ سید صاحب کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں، بعد میں جب سید صاحب کی مصروفیات زیادہ بڑھ گئیں اور دارالمصنّفین میں رفقاء کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تو اس کو مرتب کرنے کا کام انھوں نے دوسرے رفقائے دارالمصنّفین کے سپرد کر دیا جن حضرات کے نام سے بعد میں اخبار علمیہ شائع ہوئے ہیں ان میں نجیب اشرف ندوی مرحوم، مولانا ریاست علی ندوی مرحوم اور ڈاکٹر محمد عزیر صاحب، سابق استاد شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں، معارف کا یہ عنوان اتنا دلچسپ ہوتا تھا کہ بہت سے لوگ تو مقالات کے مطالعے سے پہلے اسی کا مطالعہ کرتے، اب ہم اخبار علمیہ کے چند اقتباسات ہدیۂ ناظرین کریں گے، جس سے ان کی اہمیت اور دلچسپی کا اندازہ لگانا آسان ہوگا، لندن کی ایک عجیب وغریب لڑکی کے حالات وہاں کے روزنامہ ''ڈیلی ایکسپریس'' میں شائع ہوتے تھے، معارف نے اس کی تلخیص بڑے دلچسپ انداز سے کر کے اپریل ۱۹۲۰ء کے شمارہ میں شائع کی جو درج ذیل ہے:

''لندن کا روزنامہ ڈیلی ایکسپریس'' امریکہ کی ایک عجیب وغریب لڑکی کے حالات شائع کرتا ہے، جس کی حیرت انگیز دماغی قوت ایک معجزہ ہے، اس کا سن ابھی پورے ایک

سال کا بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ اسی وقت سے وہ مسلسل گفتگو کرنے لگی، دو برس کے سن میں اس نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا، چار برس کی عمر میں اس نے یورپ کی سیر کرنا شروع کر دی اور نہ صرف اپنا سفر نامہ لکھتی رہی، بلکہ ساتھ ہی ساتھ مشہور لاطینی شاعر ورجل کے کلام کا ترجمہ بھی کرتی گئی، پانچ برس کی عمر میں اس نے برلن (جرمنی) میں تعلیم حاصل کی، اور اس وقت سے نثر و نظم میں اس کا سلسلہ تصنیف و تالیف برابر جاری ہے، اب اس کا سن سترہ سال کا ہے لیکن اتنے عرصہ میں وہ سترہ کتابوں کی مصنف ہو چکی ہے، اور دس ہزار سے زائد شعر کہہ چکی ہے اور حال میں اس نے اپنے روز نامچہ کے شائع کرنے کا اعلان کیا ہے، جسے وہ دو برس کے سن سے لکھ رہی ہے، وہ سترہ زبانیں بول سکتی ہے، لکچر دیتی ہے اور بائسکوپ کے لئے ایکٹرس کا کام بھی کرتی ہے، اس کا مستقل مشغلہ تصنیف و تالیف و مضمون نگاری ہے، چنانچہ اس وقت وہ ۱۱۰ پونڈ (۱۶۵ روپیہ) ماہوار محض قلم کی محنت سے کما رہی ہے، اس معجزانہ دماغی زندگی کے ساتھ اس کی جسمانی صحت و توانائی بھی قابل رشک ہے، اس کا قد ۵ فٹ ساڑھے سات انچ ہے جو طویل القامت مردوں کا ہوتا ہے اور اسی جثہ کی مناسبت سے طاقت بھی رکھتی ہے، چنانچہ کشتی میں بہتوں کو زیر کر چکی ہے، وہ متاہل زندگی کو پسند کرتی ہے اور شادی کا ارادہ رکھتی ہے، اس کا نام مس سیکول اسٹونر ہے۔" (۸)

یہ اخبار علمیہ صرف محیر العقول واقعات نقل کرنے پر ہی اکتفا نہ کرتا، بلکہ یورپی سائنسدانوں کے انکشافات کا بھی ترجمہ و تلخیص کرتا، اس نوع کی ایک چھوٹی سی خبر درج ذیل ہے جو جون ۱۹۲۰ء کے معارف میں شائع ہوئی تھی:

"نیویارک میڈیکل سوسائٹی (امریکہ) کے روبرو اس کے صدر نشین ڈاکٹر فیسک نے لکچر دیتے ہوئے بیان کیا کہ سائنس کی مدد سے بعض مکھیوں کی عمران کے عام اوسط عمر کے مقابلہ میں نہ صد چند (۹۰۰ گنی) بڑھائی جا چکی ہے، ایسی حالت میں یہ امید کرنا بے جا نہیں کہ انسان کی عمر بھی سائنٹیفک تدابیر سے نو سو سال کی ہو سکے لیکن آخر میں ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی تسلیم کیا کہ جب تک سائنس اس حد تک ترقی کرے اس وقت تک ممکن ہے کہ سطح ارض پر حیات کا نشان بھی نہ باقی رہ جائے۔" (۹)

فروری ۱۹۲۸ء کا اخبار علمیہ بالیقین سید صاحب کی طراوش قلم کا نمونہ ہے جو ان کے مختصر نام ''س'' سے شائع ہوا ہے، اس اخبار علمیہ کی ابتدا میں سید صاحب نے لفظ ڈاکٹر کے معنی کے بارے میں جو اطلاعات فراہم کی ہیں ان سے بہت سے وہ حضرات اب تک ناواقف ہوں گے جو پی ایچ ڈی کی ڈگری رکھنے کی وجہ سے ''ڈاکٹر صاحبان'' کہلاتے ہیں، سید صاحب رقم طراز ہیں:

''آج کل ڈاکٹر کا لقب متعدد علوم وفنون کے ماہروں کو یونیورسٹیاں دیتی ہیں مگر اس لفظ کے ابتدائی معنی اس قدر عام نہیں ہیں، ڈاکٹر لاطینی زبان کا ایک لفظ ہے، جس کے اصلی معنی معلم اور استاد کے ہیں، قرون وسطیٰ میں یہ لقب دینیات اور منطق کے معلموں کے لئے مخصوص تھا، جو اس زمانہ میں لاطینی زبان میں ان دونوں علموں کی تعلیم دیا کرتے تھے، اور پھر جب لاطینی ہی زبان میں طب کی بھی تعلیم شروع ہوئی تو طبیبوں کو بھی ڈاکٹر کہنے لگے، قانون کے کامیاب علماء کو ڈاکٹر کا لقب سب سے پہلے ۱۱۳۰ء میں بولونی (فرانس) میں دیا گیا، پھر اس لفظ نے یہاں تک وسعت اختیار کی کہ اب فلسفہ، زبان، تاریخ، موسیقی اور دوسرے علمی شعبوں کے ماہروں کو بھی یہ لقب دیا جانے لگا۔'' (۱۰)

جون ۱۹۲۸ء کا اخبار علمیہ مرحوم نجیب اشرف ندوی کا مرتب کردہ ہے جو ان کے مختصر نام ''ن'' سے شائع ہوا ہے، اس کی ایک خبر خاص طور سے دلچسپ ہے جس کا تعلق اس خیال سے ہے کہ ہندوستان کی تباہی، بربادی اور زوال کا سب سے بڑا سبب چاول خوری ہے، یہ نظریہ ایک سائنسداں کا قائم کردہ تھا، جس کو خبر کے انداز میں نجیب اشرف ندوی صاحب نے اس طرح تحریر کیا ہے:

''مسٹر مسمورا نے جاپان کے ایک علمی رسالہ میں ایشیائیوں کی خوراک سے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے تنزل کا سبب چاول کا استعمال ہے، ان کا خیال ہے کہ ہندوستان کی تباہی، بربادی اور زوال کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ یہاں کی کثیر آبادی چاول استعمال کرتی ہے، چنانچہ اس اثر سے نجات حاصل کرنے کے لئے خود جاپان میں یہ تحریک قوت حاصل کر رہی ہے، کہ وہاں چاول کی جگہ آلو کی روٹیوں کا استعمال کیا جائے اور خیال کیا جاتا ہے کہ بہت جلد یہ چیز ملک میں عام ہو جائے گی۔'' (۱۱)

سید صاحب کے دور ادارت میں جو رفقائے دار المصنفین اخبار علمیہ مرتب کرتے ان میں

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کا نام بھی شامل ہے، جہاں تک ہم کو علم ہے شاہ صاحب انگریزی زبان سے اس قدر واقف نہ تھے کہ اس سے براہ راست ترجمہ کر کے اخبار علمیہ مرتب کرتے، اس لئے ہمارا قیاس ہے کہ انھوں نے جو اخبار علمیہ مرتب کئے ہیں وہ عربی سے ترجمہ ہوں گے، بہرحال ان کے اخبار علمیہ کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو جو فروری ۱۹۳۰ء میں ان کے مختصر نام ''م'' سے شائع ہوا تھا:

''ولایات متحدہ امریکہ کے کانوں کے شعبہ کے ماہرین حیاتیات کی رائے ہے کہ چھوٹے چھوٹے کیڑے پتھر کا کوئلہ بنانے میں بہت معاون ہوتے ہیں، اس کے ثبوت میں وہ اپنے مشاہدات بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے بعض ایسے قوی جراثیم کا مشاہدہ کیا ہے جو لکڑی پر زندگی بسر کرتے ہیں، اور مدتوں زندہ رہتے ہیں، اس لئے بہت ممکن ہے کہ اسی قسم کے جراثیم پتھر کے کوئلہ کی پیدائش کا سبب ہوتے ہوں، اس اعتقاد کی مزید تائید اس سے ہوتی ہے کہ انھوں نے ان نباتات کی تحلیل کے وقت جو پتھر کے کوئلہ کا قالب بدل رہی ہیں ان میں بہت ہی چھوٹے جراثیم کا مشاہدہ کیا ہے، اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اسی قسم کے جراثیم نباتات کی طبیعت میں تبدیلی پیدا کر کے اس کے کوئلہ بنانے میں معاون ہوتے ہیں۔''(۱۲)

سید صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ صرف کام کرنا ہی نہ جانتے تھے بلکہ اپنے شاگردوں سے کام لینا بھی جانتے تھے، مولانا ریاست علی ندوی سابق رفیق دارالمصنفین سید صاحب کے ان شاگردوں میں تھے جن کو وہ عزیز رکھتے، سید صاحب نے ان سے بھی اخبار علمیہ مرتب کروایا جس کا ایک نمونہ درج ذیل ہے:

''چند ماہرین زراعت سویڈن کے پایۂ تخت اسٹاک ہوم میں پودوں میں بجلی کے اثرات ڈال کر زراعت کی ترقی کے وسائل کا تجربہ کر رہے ہیں کہ برقی رو درختوں کی بالیدگی میں معاون ہو سکتی ہے یا نہیں، چنانچہ آج کل ان کے تجربوں کی جولانگاہ ایک باغ ہے، اس باغ میں زیر زمین ایک ایک قدم کے فاصلہ پر بجلی کے تار نصب کر کے ان کو اوپر سے پختہ اینٹوں سے پاٹ دیا گیا ہے اور پھر ان اینٹوں پر مٹی ڈال دی گئی ہے، اور اس طرح بجلی کے اثر کو درختوں میں منتقل کرنا چاہا ہے، اگر ان درختوں نے اثر قبول کر لیا تو وہ جلد سے

جلد نشو ونما پاکر پھیلنے لگیں گے لیکن ابھی تک اس کے کسی نتیجہ کا اعلان نہیں ہوا ہے۔'' (۱۳)

ان چند اقتباسات سے اس بات کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اخبار علمیہ معارف کو کس قدر دلچسپ بنا دیتا تھا، صرف دلچسپ ہی نہیں بلکہ لوگوں کوئی نئی معلومات بھی فراہم کرتا تھا، افسوس ہے کہ بعد میں نامعلوم اسباب کی وجہ سے یہ دلچسپ سلسلہ بند کر دیا گیا۔

سید صاحب کے دور ادارت میں ایک اور دلچسپ اور مفید سلسلہ ''آثار علمیہ وادبیہ'' کے نام سے شائع ہوا کرتا تھا، جو ہر شمارہ میں تو نہ ہوتا مگر چند ماہ کے بعد اس عنوان کے تحت کوئی نہ کوئی نادر ادبی یا علمی تحریر خواہ وہ نثر میں ہو یا نظم میں شائع کی جاتی، اس عنوان سے بھی معارف کے فائلوں میں اتنا مواد موجود ہے کہ اگر ان سب تحریروں کا جائزہ لیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی، اس لئے ہم سرسری طور سے صرف چند شماروں کے آثار علمیہ وادبیہ کالم سے کم سے کم الفاظ میں تعارف کرانے پر اکتفا کریں گے، مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی جب خلافت کانفرنس کے سلسلے میں یورپ گئے تو ان کو لندن جانے اور وہاں قیام کرنے کا موقع ملا، اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے مختلف کتب خانوں کی سیر کی اور وہاں کے اہل نظر سے بھی ملاقاتیں ہوئیں، وہ جب ایوان وزارت ہند (لندن) گئے تو ان کو پتھر اور دھات پر مشرقی شعراء کا کلام بھی منقوش نظر آیا، جس کو انھوں نے نقل کر کے دفتر معارف بھیجا اور یہ اشعار مئی ۱۹۲۰ء کے معارف میں آثار علمیہ وادبیہ کے عنوان سے شائع کئے گئے، ہم فارسی اشعار سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف ان اردو اشعار کو درج ذیل سطور میں نقل کر رہے ہیں جن کو سید صاحب نے نقل کیا تھا۔

ستانا دل کا اے صاحب برا ہے ☆ قلوب مرد ماں عرش خدا ہے

عدل کر دنیا میں غافل زندگانی پھر کہاں
زندگانی گر رہی تو یہ حکومت پھر کہاں

سدا عیش دنیا دکھاتا نہیں ☆ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

فروری ۱۹۳۰ء کے معارف میں اس عنوان کے ذیل میں مولانا حالی کا ایک نادر علمی وادبی خط شائع کیا گیا ہے، یہ خط مولانا حالی نے محمد اعجاز حسن کو ۳؍ اپریل ۱۹۱۳ء میں لکھا تھا، جب کہ ان کے ہاتھوں میں کافی رعشہ آ چکا تھا، مولانا حالی کے اس خط کی شان نزول یہ ہے کہ غالب کے ایک

قصیدہ کے یہ دو شعر اعجاز حسن صاحب کی سمجھ میں نہ آتے تھے۔

نتواں شمار دولت جاوید یافتن ☆ درخورز روئی ہندسہ گاہے شمار یافت

ازبس پراست جیب مسمّیٰ زنقد اسم ☆ ہرجا الف بنشت محاسب ہزار یافت

انھوں نے مولانا حالی کو خط لکھ کر ان اشعار کے معنی پوچھے تھے، حالی پر بعض حلقوں کی طرف سے غالب پرستی کا الزام لگایا جاتا ہے لیکن مولانا حالی کا یہ مختصر سا خط اس الزام کی پوری پوری تردید کرتا ہے، یہ خط چونکہ مختصر ہے اس لئے ذیل کی سطور میں نقل کیا جاتا ہے:

''مکرمی! اگرچہ مرزا صاحب کو میں عالم تخیل کا شہباز بلند پرواز سمجھتا ہوں اور ہندوستان کی فارسی شاعری کا ان پر خاتمہ سمجھتا ہوں، لیکن مثل دیگر اساتذہ کے ان کو بھی خطا اور لغزش سے پاک نہیں سمجھتا، میں اب لکھنے پڑھنے کے قابل نہیں رہا لیکن آپ کا شوق مفرط دیکھ کر بہ تکلف شعر مسئول عنہ کو معنی پہناتا ہوں، آپ کو معلوم ہے کہ ہر حرف کا ایک مسمّیٰ ہوتا ہے اور ایک اسم مثلاً ''ا'' مسمّیٰ ہے اور ''الف'' اس کا اسم ہے یا مثلاً ''ج'' مسمّیٰ ہے اور جیم اس کا اسم ہے، کہتا ہے کہ ممدوح کی دولت جاوید کسی طرح شمار نہیں ہو سکتی، کیوں کہ محاسب اس کی دولت کو گننا شروع کرتا ہے، تو ایک کے ہزار ہو جاتے ہیں جیسے ''ا'' کا اسم ''الف'' ہے اور الف کی ایک شکل ہے، تو گویا اس کی دولت کا ایک گننے سے ہزار گونہ ہو جاتا ہے۔

مگر میرے نزدیک یہ خیال مرزا صاحب سے بہ وجہ احسن ادا نہیں ہوا، جیب مسمّیٰ کا نقد اسم سے پُر ہونے سے یہ مراد ہے کہ ایک کے ہزار ہو جاتے ہیں۔'' (۱۴)

والسلام الطاف حسین حالی۔ از پانی پت ۳ر اپریل ۱۹۱۳ء

اسی طرح اپریل ۱۹۳۰ء کے معارف میں مولانا ارشاد حسین صاحب مجددی رامپوری کا ایک فارسی خط شائع کیا گیا ہے، یہ خط بھی محمد اعجاز حسن صاحب کے ذخیرہ میں محفوظ تھا، جس کو انھوں نے معارف میں اشاعت کے لئے بھیجا تھا، اس خط پر معارف نے نوٹ لگاتے ہوئے لکھا تھا۔

''حضرت مولانا ارشاد حسین مجددی رامپوری اخیر زمانہ کے بڑے صاحب حال عالم

تھے، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ کے خاندان سے تھے، اپنے زمانہ میں فقہ حنفی کے مشہور شارح تھے، بڑے بڑے باکمال لوگوں نے ان سے درس لیا، حضرت الاستاذ علامہ شبلی نعمانی بھی ان کے تلامذہ اور مستفدین میں تھے۔۱۳۱۱ھ میں وفات پائی۔''(۱۵)

اس خط کی شان نزول یہ ہے کہ درج ذیل فارسی شعر محمد اعجاز حسن صاحب کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

زاں روی کہ چشم تست احول ☆ معبود تو پیر تست اول

مولانا ارشاد حسین صاحب مجددی کا فارسی خط اسی شعر کی شرح بیان کرتا ہے۔ تصور شیخ، تصوف کا ایک اہم مسئلہ ہے جن لوگوں کو تصوف سے کوئی لگاؤ ہے ان کے لئے یہ خط بڑی اہمیت کا حامل ہے لیکن چوں کہ یہ خط فارسی میں ہے اس لئے اس سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

''باب التقریظ والانتقاد'' بھی معارف کا ایک اہم عنوان تھا، اس عنوان کے تحت اگر چہ ہر ماہ کسی نئی کتاب کا نقد و جائزہ پیش نہیں کیا جاتا مگر دوسرے تیسرے ماہ ضرور قارئین معارف کی علمی ضیافت کے لئے یہ باب حاضر رہتا، اس عنوان کے تحت کتابوں کا اتنا بھرپور اور ناقدانہ تعارف کرایا جاتا کہ اس کو آج کی اصطلاح میں ریویو آرٹیکل کہنا ہی مناسب ہوگا، اس باب کے مندرجات پر بھی بھرپور نظر ڈالنے کے لئے پوری ایک جلد درکار ہوگی اس لئے صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اردو دنیا کو شاید ہی آج اس بات کا علم ہو کہ ٹیگور کے ایک عشقیہ مجموعۂ منظومات ''گارڈنر'' کا اس صدی کے دوسرے دہے میں عربی زبان میں ترجمہ ہو گیا تھا، جس کا نام ''البستانی'' ہے، مئی ۱۹۲۰ء کے معارف میں قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی نے باب التقریظ والانتقاد کے عنوان کے تحت البستانی کا بڑے اچھے انداز سے تعارف کراتے ہوئے اردو خوانوں کو اس کی خوبیوں سے آگاہ کیا ہے، مبصر نے ٹیگور کے اشعار کے اردو ترجمے کے پہلو بہ پہلو عربی ترجمہ سے اقتباسات نقل کر کے ترجمے کی خوبی، نزاکت اور لطافت کو بڑے اچھے انداز سے واضح کیا ہے، اس ترجمہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے مبصر نے لکھا ہے:

''ترجمہ کی دقتوں سے وہی لوگ خوب واقف ہیں جنہیں اس کام سے کبھی سابقہ پڑا

ہے، ایک زبان کے محاورات، بندش، اسلوب بیان کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کر دینے سے وہ خوبی اور زور اثر قائم نہیں رہتا اور مترجم کو اپنی طرف سے بعض ضروری تصرفات کرنے پڑتے ہیں، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو بستانی کا یہ ترجمہ انگریزی ترجمہ سے جو خود مصنف نے کیا ہے قریب تر ہے اور موجودہ عربی زبان کا ایک عمدہ نمونہ ہے، جس میں ہندی خیالات کو نہایت خوبصورتی سے ادا کیا گیا ہے۔'' (۱۶)

اس طرح جون ۱۹۲۰ء کے معارف میں لیکی کی کتاب ''تاریخ اخلاق یورپ'' کے اردو ترجمہ کا جائزہ لیا گیا ہے، یہ ترجمہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلم کا رہین منت ہے، جس کو انجمن ترقی اردو نے شائع کیا تھا، اس کتاب کے مبصر مولانا عبدالباری مرحوم ہیں جو عباری کے مختصر نام سے معارف میں فلسفیانہ مقالات لکھا کرتے تھے، اس تبصرہ میں مولانا عبدالباری مرحوم نے صرف زیر نظر کتاب کی تعریف وتوصیف ہی نہیں کی ہے بلکہ ان کو جہاں بھی مصنف کے افکار وخیالات میں جھول نظر آیا، یا انداز بیان میں ژولیدگی دکھائی پڑی ان سب کا بھی انھوں نے ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔

جنوری ۱۹۲۸ء کے شمارہ میں اسی عنوان کے تحت مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے میر دبیر قاضی ولی محمد صاحب کی کتاب ''سفرنامۂ اندلس'' کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے، میر دبیر قاضی ولی محمد اس زمانے میں ''تاریخ اندلس'' پر ایک کتاب لکھ رہے تھے، انھوں نے اس کتاب کے سلسلے میں براہ راست معلومات حاصل کرنے کے لئے اندلس کا سفر کیا، تاکہ وہاں کے آثار کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ان کے بارے میں فیصلہ کریں۔

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے میر دبیر قاضی ولی محمد کے درج ذیل فقروں ''حمام ٹھنڈا پڑا ہے لیکن مجھ مردہ دل کا بدن اس میں پہنچتے ہی گرما اٹھا'' ''الناصر کی خواب گاہ ایک خواب وخیال'' ''کمرۂ مونس کے مجسمہ طیور اڑ گئے۔'' پر تبصرہ کرتے ہوئے جو عبارت تحریر فرمائی وہ یہ ہے:

''ان فقروں پر مولوی محمد حسین آزاد کی انشاپردازی کا دھوکہ ہوتا ہے لیکن یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ سفرنامے میں صرف لفاظی ہی لفاظی سے کام لیا گیا ہے بلکہ اس انشاپردازی کے ساتھ اس اجڑے ہوئے ملک کے متعلق معلومات کا بھی کافی ذخیرہ فراہم کیا گیا ہے، چنانچہ سب سے پہلے اسپین کے جغرافیانہ حالات اور ملک کی قدرتی اور طبعی پیداوار سے

بحث کی گئی ہے اور اہل ملک کے وضع ولباس اور اخلاق وعادات کا نقشہ کھینچا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسپین میں عربی اور اسلامی اخلاق کا کس قدر اثر اب بھی موجود ہے، اس کے بعد اسپین کے مشہور شہروں اور مشہور عمارتوں کے حالات نہایت تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں اور ان کے متعلق جا بجا نہایت مفید تاریخی معلومات درج کیے ہیں۔'' (۱۷)

مولانا مرحوم نے اس کتاب پر صرف دو صفحات کی تحریر رقم فرمائی ہے لیکن اس اختصار کے باوجود اس کتاب کی ایک ایک خوبی ہماری نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہو جاتی ہے۔

فروری ۱۹۳۰ء کے معارف میں اس عنوان کے تحت مولانا سید سلیمان ندوی کی ایک دلچسپ تحریر ملتی ہے، دلچسپ یوں کہ سید صاحب نے مرحوم ظفر عمر کی کتاب ''لال کھٹور'' پر اپنے مخصوص انداز میں نظر ڈالی ہے، افسانوں کی بہت ہی کم کتابیں ہوں گی جن پر سید صاحب نے اظہار خیال کیا ہو، اس لئے اس تحریر کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے، اس کتاب کے مصنف کے بارے میں سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''اردو میں سراغ رسانی کے افسانہ لکھنے والوں میں ہمارے دوست جناب ظفر عمر صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس صوبۂ متحدہ (جون پور) نے خاص شہرت حاصل کی ہے، چوروں کا کلب، بہرام کی گرفتاری اور نیلی چھتری ان کے بہترین افسانے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ ان کا نیلی چھتری سب سے زیادہ دلچسپ، مقبول اور ہر دلعزیز افسانہ ہے اور شاید ان کے قلم کا بہترین کارنامہ، جس میں آرسن لوپن کی کارفرمائیوں کی جھلک پوری طرح نمایاں ہے۔'' (۱۸)

اس کے بعد وہ لال کھٹور کے بارے میں انتہائی نپی تلی مگر محرمانہ رائے دیتے ہیں، ان کے خیال میں لال کھٹور کوئی فرضی افسانہ نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے جس کو ''بادہ وساغر'' کی زبان میں لکھا گیا ہے، بقول سید صاحب:

''ابھی حال میں انھوں نے لال کھٹور کے نام سے ایک تازہ افسانہ حوالۂ قلم کیا ہے اور چھپ کر شائع ہوا ہے، یہ بھی سراغ رسانی کا دلچسپ افسانہ ہے، مگر اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ تمام تر فرضی افسانہ نہیں بلکہ ''بادہ وساغر'' کہہ کر اس میں ''معاملۂ حق کی گفتگو'' کی ہے

اور زمانۂ ماضی کی فرضی داستان نہیں بلکہ زمانۂ حال کے کچھ "حقائق وثائق" ہیں۔" (۱۹)

اسی سال مارچ کے معارف میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم کی ایک خاصی طویل تحریر، مولانا سلیمان اشرف مرحوم کی کتاب "المبین" پر باب التقریظ والانتقاد کے عنوان کے تحت شائع ہوئی ہے، یہ تحریر اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ ایک ماہر لسانیات نے اپنے ہی پایہ کے ایک عربی عالم کی کتاب پر بڑا سخت ناقدانہ محاکمہ کیا ہے، المبین میں سلیمان اشرف مرحوم نے عربی زبان کے فضائل اور اس کے بے نظیر خصائص بتلا کر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ دنیا کی تمام زبانوں پر فوقیت رکھتی ہے، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے مولانا کے تقریباً ہر بیان سے اختلاف کیا ہے، ہم اس تحریر میں ان کے تمام اعتراضات کی نشاندہی تو نہ کر پائیں گے نمونے کے طور پر چند اشارے کرنے پر اکتفا کریں گے، مثلاً مولانا سلیمان اشرف نے اپنی کتاب میں تحریر فرمایا تھا:

"سنسکرت نے مخارج حروف تہجی کے لئے آٹھ مقام متعین کئے اور یہ سب سے بڑی تعداد ہے، جسے عجمی زبانون نے پیش کیا ہے، ان زبانوں کو چھوڑیے جنھوں نے نہ مخارج کو جانا نہ ادائے حروف کے لئے۔ ان کے قواعد تعلیم وضع ہوئے .... اب عربی زبان کو دیکھئے جس کے حروف تہجی کی کل تعداد ۱۹ ہے، اس نے جب حرفوں کے مخارج کی طرف صحیح احساس وتمیز سے غور کیا تو مخارج کا تعین ۱۷ مقام پر ہوا۔" (۲۰)

اس کا تعاقب کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

مصنف نے یہ نہ سوچا کہ حروف تہجی کے مخرج کا تعین کرنا صوتیات کے ماہروں کا کام ہے نہ خود زبان کا اور یہ کہ آوازوں کی کسی جنس کی انواع میں تقسیم کرنے کی ذمہ دار زبان نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے زبان کی آوازوں کے مخرجوں کو کم یا زیادہ انواع میں تقسیم کیا ہے، ممکن ہے کہ ایک ہی زبان کی آوازوں کو ایک ماہر صوتیات زیادہ انواع میں تقسیم کرے اور دوسرا کم انواع میں، پھر تقسیم خود بھی متنوع ہو سکتی ہے، یہ خیال بھی درست نہیں کہ کوئی زبان ایسی بھی ہو سکتی ہے کہ حرف رکھتی ہو مگر ان کے مخرج متعین نہ ہو سکیں یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ عربی زبان نے "حرفوں کے مخارج کی طرف صحیح احساس وتمیز سے غور کیا" سے مصنف علام کا مقصود کیا ہے، کیا دنیا کی کسی بولی میں احساس اور غور کی قدرت

بھی ہے؟ اگر "زبان" سے "مجازاً" زبان کے بولنے والے یا اس کے محقق مراد ہیں تو یہ شاعری یقیناً بے محل ہے۔" (۲۱)

اس طرح ڈاکٹر صاحب مرحوم نے مولانا سلیمان اشرف مرحوم کے ہر باب کا پوسٹ مارٹم کیا ہے، جس کا نقل کرنا طوالت کا سبب ہوگا، اس لئے اس انتقاد کے آخری حصے کا ایک نمونہ بطور مثال پیش کیا جاتا ہے۔

مولانا سلیمان اشرف کی کتاب ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے:

"ایک ثلث حصہ کتاب کا ڈیڑھ مہینے میں مبیضہ بھی ہو گیا لیکن اس منزل پر پہنچ کر عجمیت کی بے جا عصبیت عربی کے نطق وصداقت سے ایسی دست وگریباں ہوئی کہ تاتاریوں اور چنگیز خاں کے ہاتھوں علمی دنیا میں جو کچھ ہوا تھا، تاریخ نے مختصر طور پر گویا اسے پھر دہرادیا۔

مہینوں کا ذکر کیا سال پر سال گزرتے چلے گئے لیکن تعصب کا جوش نہ کم ہونا تھا نہ ہوا، کتاب نامکمل رہی اور بجز سکوت کوئی صورت امان کی نظر نہ آئی۔" (۲۲) (المبین ص ۱۶۸)

ڈاکٹر صاحب کا اس عبارت پر تبصرہ ملاحظہ ہو:

"بہت غور کیا مگر صرف اتنا معلوم ہوا کہ مصنف پر کسی نے ظلم کیا جس کی یہ شکایت ہے، جن لوگوں نے ظلم کیا وہ "تاتاری" کہے گئے اور ان کے سرگروہ کو "چنگیز خاں" کا خطاب ملا، مگر آخر یہ کس گروہ اور کس شخص کی طرف اشارہ ہے، اس قسم کا طنز وکنایہ علمی تقریر وتحریر میں محمود نہیں اور اگر کسی کے جور وستم کی شکایت ضروری تھی تو صاف صاف نام لینے میں کون سا امر مانع تھا، مصنف کو یہ بھی خیال کرنا چاہئے تھا کہ ناموں کا خفیہ رکھنا ان کی مصلحت کے بھی خلاف ہے، اس لئے کہ اگر بعض لوگ اس عبارت کو پڑھ کر اس کے لکھنے والے سے ہمدردی کریں گے تو بہت سے لوگ یہ بھی خیال کریں گے کہ ممکن ہے کہ وہ ظالم ایک سخت گیر عادل ہو اور اس کی شکایت بے جا۔

المبین کے مصنف کا یہ طرز ادا عجمیت کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے، ورنہ عرب تو جو کچھ کہتا ہے مردانہ وار کہتا ہے۔" (۲۳)

غرض کہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم کی یہ انتقادی تحریر پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے جس میں وہ اپنی پوری جلالت کے ساتھ ساتھ طنز و تشنیع کے اسلحوں سے بھی آراستہ نظر آتے ہیں۔

صرف ان ہی چند نمونوں سے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس عنوان کے تحت کیسی کیسی جاندار تحریریں شائع ہوتی تھیں، معارف کا یہ عنوان آج بھی باقی ہے اور اب بھی کبھی کبھی اس عنوان کے تحت کوئی بھولی بسری تحریر نظر آجاتی ہے، جس پر ہم آئندہ سطور میں روشنی ڈالیں گے۔

معارف کے درج بالا عنوانات کا ایک اجمالی جائزہ لینے کے بعد ہم اس کے دور اول کے مقالات پر ایک نظر ڈالیں گے جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ معارف نے اپنی اشاعت کے روز اول ہی سے مذہبی علوم کے علاوہ فلسفہ، طب، ہیئت، تاریخ، ریاضی، منطق جیسے علوم پر بھی اپنے پڑھنے والوں کو خاصا اور اہم مواد فراہم کیا، اسی کے ساتھ ساتھ اردو، عربی اور فارسی ادبیات پر بالعموم اور یورپی ادبیات پر شاذ و نادر مقالات شائع کر کے اپنے قارئین کے ادبی ذوق کی آبیاری کی، یہ معارف کے عنفوان شباب کا زمانہ تھا اس لئے اس میں شائع ہونے والے مقالوں میں اجتہادی شان نمایاں تھی، افسوس ہے کہ ہم اپنے اس جائزہ میں معارف کے تمام مقالات کا جائزہ نہ لے سکیں گے اور ہم کو اپنے موضوع کی مناسبت سے خود کو صرف اردو ادبیات کے دائرہ تک محدود رکھنا ہوگا، اردو ادبیات سے متعلق مقالات پر بحث کرتے ہوئے بھی ہم معارف میں شائع ہونے والے تمام مقالات کا جائزہ نہ لے سکیں گے بلکہ صرف چند مقالات کا بطور نمونہ ذکر کریں گے۔

جون ۱۹۲۰ء کے معارف میں سید سلیمان ندوی مرحوم کا ایک مقالہ ''انڈیا آفس لائبریری میں اردو کا خزانہ'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے، یہ مقالہ اس زمانے کی یادگار ہے جب سید صاحب خلافت کانفرنس کے سلسلے میں لندن میں مقیم تھے، اپنی تمام سیاسی مشغولیات کے باوجود انھوں نے اتنا وقت نکالا کہ وہ انڈیا آفس لائبریری میں جا کر وہاں محفوظ اردو کے خزانے کا ایک جائزہ لیں، سید صاحب کی یہ تحریر ۲۷/اپریل ۱۹۲۰ء کی لکھی ہوئی ہے، اب تو ہندوستان کے اسکالروں ہی کو نہیں عام آدمیوں کو بھی برطانیہ جانے کا اکثر اتفاق ہوا کرتا ہے، اگر اس زمانے میں کوئی اسکالر لندن میں محفوظ کسی مخطوطے یا مطبوعہ کتاب کو دریافت کر لے تو علمی لحاظ سے اس کا یہ کام اہم تو ضرور ہوگا مگر اس اہمیت کا حامل نہ ہو پائے گا جس اہمیت کا حامل اس وقت تھا جب خال خال ہی لوگ برطانیہ

جا پاتے، سید صاحب کے اس مقالے کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ بعض حلقوں کا اردو پر یہ سراسر بہتان ہے کہ وہ قصہ کہانیوں اور شاعری کی زبان رہی ہے، اسی وجہ سے اس میں علوم وفنون کا ذخیرہ کم ہی ملتا ہے، سید صاحب نے اپنے مقالے میں علوم وفنون کے ذیل میں درج ذیل موضوعات کی کتابوں کی نشاندہی کی ہے۔

﴿۱﴾ زراعت ونباتات۔ ﴿۲﴾صنعت وحرفت۔ ﴿۳﴾ ہیئت ونجوم۔ ﴿۴﴾علم الطبخ۔ ﴿۵﴾نیرنگ وطلسمات۔ ﴿۶﴾علم المنزل وقواعد صحت۔ ﴿۷﴾نقشہ کشی۔ ﴿۸﴾اخلاق۔ ﴿۹﴾ورزش وسپہ گری۔ ﴿۱۰﴾قانون۔ ﴿۱۱﴾انگریزی قانون۔ ﴿۱۲﴾ ہندوقانون۔ ﴿۱۳﴾اسلامی قانون۔ ﴿۱۴﴾منطق وفلسفہ۔ ﴿۱۵﴾طب وتشریح۔ ﴿۱۶﴾علم الحرب۔ ﴿۱۷﴾موسیقی۔ ﴿۱۸﴾لغت۔ ﴿۱۹﴾علم السنہ۔ ﴿۲۰﴾طبیعات۔ ﴿۲۱﴾ معاشیات۔ ﴿۲۲﴾علم المعانی والبیان۔ ﴿۲۳﴾اجتماعیات۔ ﴿۲۴﴾طب حیوانات۔(۲۴)

صرف اسی ایک عنوان کے ذیل میں آنے والے موضوعات کے مطالعے سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت سے پہلے علوم وفنون کے ذیل میں اردو میں کتنا سرمایہ فراہم کیا جاچکا تھا، سید صاحب نے معارف میں ان کتابوں کی جو فہرست شائع کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۲۴ء میں خلاصۂ علم الارض کے نام سے کلکتہ سے ایک کتاب شائع ہوئی تھی جو انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہے، علاوہ بریں علم ہیئت مترجمہ لفٹنٹ میلس لکھنؤ ۱۸۳۲ء مفتاح الافلاک از عبدالسلام ۱۸۳۳ء، اقبال فرنگ نواب اقبال الدولہ بہادر کلکتہ ۱۸۳۴ء، نظام آسمانی (انگریزی مع ترجمہ ہندوستانی) کلکتہ ۱۸۳۶ء بھی سید صاحب کے درج ذیل الفاظ کی پرزور تائید وتوثیق کرتی ہیں:

”ذیل میں ہر عنوانات سنہ میں سے چند کتابوں کے نام، بقید نام مصنف وتاریخ وطبع ومقام طبع لکھے جاتے ہیں، اس انتخابات میں قصداً صرف وہی کتابیں لی ہیں جو غدر سے پہلے یا اوس کے بعد کسی قریب زمانہ میں لکھی گئی ہیں، قصص ومنظومات کو ہاتھ نہیں لگایا ہے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ اردو میں اس کا بڑا ذخیرہ ہے، صرف علمی کتابیں لی ہیں، ان پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ علوم جدیدہ کی مختلف شاخوں میں کس سرعت سے اردو اوس وقت تک ترقی

کر رہی تھی، جب تک وہ تمام ملک کی مسلم زبان تھی اور نفاق قومی سے نا آشنا تھی۔ (۲۵)

اسی سلسلۂ سخن میں ہم مولوی محمود زماں خان صاحب رامپوری کے مقالے ''ڈاکٹر اقبال کی اردو'' پر ایک نظر ڈالتے ہیں جو مئی ۱۹۲۸ء کے معارف میں شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر اقبال کی شاعری عوام میں جیسے جیسے مقبول ہوتی گئی ان پر اعتراض کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھنے لگی، یہ معترضین ڈاکٹر اقبال کے افکار وخیالات پر تو کم ہی گرفت کر پاتے، اس لئے ان کی زبان پر مشق ستم کیا کرتے، اسی طرح کا ایک مقالہ جولائی ۱۹۲۷ء کے ''مرقع'' لکھنؤ میں شائع ہوا تھا، جس کی تعقیب میں مولوی محمود زماں صاحب نے یہ مقالہ معارف میں شائع کروایا تھا، اس مقالہ کی تمہید میں مولوی صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں:

> ''جولائی ۱۹۲۷ء کے مرقع لکھنؤ میں، لکھنؤ کے ایک حکیم صاحب نے جو متعدد رسالوں کے مصنف ہیں، ڈاکٹر اقبال کی اردو زبان اور محاورات پر بہت سے اعتراضات کئے ہیں، اس سے کسی کو انکار نہیں کہ اقبال کی اردو زبان وہ زبان نہیں جس پر سخنوران لکھنؤ کو ناز ہے، ان کی شاعری ضلع جگت، روزمرہ اور خاص خاص محاورات میں پابندی سے آزاد ہے اور یہ کوئی چھپا راز نہیں، یہ چیز ہمیشہ سے سب کو معلوم ہے اور سب اس کو جانتے ہیں، اس کے لئے کسی نئی تحقیق، جدید کاوش اور تازہ کشف حقیقت کی ضرورت نہیں، پابند وضع اور اہل تقلید قدیم جماعت ہمیشہ ان کی زبان پر ناک بھوں چڑھاتی رہی ہے لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اس غصہ وغضب اور طیش کی حالت میں مضمون نگار کو صحیح وغلط اور صواب وخطا کی تمیز بھی نہ رہی اور متعدد غلطیوں کے ارتکاب سے خواص کی نظر میں خود اپنے کو مضحکہ انگیز بنالیا۔'' (۲۶)

مولوی صاحب موصوف نے حکیم صاحب کے بارے میں درج بالا سطور میں جو کچھ لکھا ہے اس کی توثیق ان کے ان اعتراضات سے ہوتی ہے۔

اقبال کا شعر ہے۔

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

حکیم صاحب نے آرامیدہ اور خوابیدہ کے الفاظ پر اعتراض کرتے ہوئے اس شعر کے بارے میں سوال کیا ہے کہ ''ہم اسے اردو کہیں یا فارسی'' مولوی محمود زماں صاحب نے غالب، خواجہ وزیر، حکیم مومن خان مومن اور آتش کے اشعار سے کئی مثالیں دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ اس طرح الفاظ کے استعمال سے اردو، اردو ہی رہتی ہے فارسی نہیں ہو جاتی، انھوں نے لکھنؤ کے دبستان شاعری کے دو مشہور شعراء آتش اور خواجہ وزیر کے درج ذیل اشعار بھی مثال کے طور پر پیش کیے ہیں۔

نزدیک آچکی ہے سواری بہار کی
برگ خزاں رسیدہ گلستاں سے دور ہو (آتش)

کر دیا ہے غم نے کاہیدہ مجھے کیا عجب ہے
استخوان تن سے جو نکلیں کہربا کے واسطے (خواجہ وزیر)

مزید براں انھوں نے اس امر کی بھی نشاندہی کی ہے کہ خواجہ آتش کی ایک پوری غزل اسی طرح کے قافیوں سے مزین ہے جس کی ردیف ہوتا تھا اور قوافی کشیدہ، بریدہ، دریدہ، رسیدہ ہیں۔

اس طرح حکیم صاحب نے اقبال کی زبان پر جو جو اعتراضات فرمائے ہیں مولوی محمود زماں صاحب نے قدماء کے اشعار سے مثالیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر سب کو درست قرار دیا ہے، اس سلسلے میں ان کی یہ کوشش رہی ہے کہ شواہد کے طور پر جو اشعار پیش کیے جائیں وہ زیادہ تر شعرائے لکھنؤ کے ہوں، ہم حکیم صاحب کے اور اعتراضات سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف دو لطیفوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

اقبال کی نظم ''پہاڑ اور گلہری'' پر حکیم صاحب نے زبان کی جو غلطیاں نکالی ہیں ان سے قطع نظر انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ گلہری کی جگہ مینڈک کا ذکر زیادہ موزوں تھا، کیوں کہ اقبال نے ''چلو بھر پانی'' میں ڈوب مرنے کی بات کہی ہے۔ اس لطیفہ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مولوی محمود زماں صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

''ارشاد ہے کہ یہاں مینڈک ہوتا تو بہت لطف دیتا لیکن کون کہے حضرت وہ تو پانی کا جانور ہے وہ پانی میں کس طرح ڈوب کر آپ کی چشم تماشائی کے ارمان نکال سکتا ہے، اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ کیا کہنا کی تکرار ناگوار ہے، افسوس ہے کہ اس ناگواریٔ خاطر کا

علاج قطعاً ناممکن ہے، کیوں کہ غرور اور شعور کے قوافی علاحدہ کر کے صرف ردیف میں تکرار ہوئی ہے اور ردیف کا مکرر آنا فنِ عروض میں لازمی اور لابدی ہے، البتہ اگر حضرت ناقد ردیف ہی کے خلاف ہو گئے ہوں اور فنِ شاعری میں نئی اصلاح کرنا چاہتے ہوں تو نہ صرف سر اقبال کی ردیف کو غلط کہنا پڑے گا بلکہ از اول تا آخر تمام اردو اور فارسی شاعری کو حرفِ غلط کی طرح صفحاتِ کتب وقلوب سے محو کرنا پڑے گا۔" (۲۷)

حکیم صاحب نے اقبال کی شاعری پر محاکمہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا:

"ان کو (ڈاکٹر صاحب کو) عشق سے جھوٹوں بھی سابقہ نہیں پڑا.......... مشرقی شاعر کو غزل کہتے وقت ضرور عاشق بن جانا چاہئے، ورنہ غزل کہنا چھوڑ دے....." (۲۸)

اس لطیفہ کا جواب مولوی صاحب موصوف نے بھی قدرے مزاحیہ انداز میں دیا ہے جو درج ذیل ہے:

"معلوم نہیں حکیم صاحب نے مرض عشق کی حقیقت کیا سمجھی ہے، میرے نزدیک تو عشق کی چسک اور تڑپ جس قدر ڈاکٹر صاحب کے اشعار اور قلب میں پائی جاتی ہے، دوسرے شعراء کے کلام میں اس کا ملنا بہت دشوار ہے، شاعر کے لئے احساس کا ہمہ گیر ہونا لازمی ہے، جو نہ صرف غزل کے دائرہ میں ایک خیالی محبوب تک محدود ہو بلکہ ہمہ تن عشق ومحبت سے پر ہو، کائنات کے ذرہ ذرہ کو محبت کی نگاہوں سے دیکھے اور ہر واقعہ سے متاثر ہو کر اپنے دردِ دل کا اظہار کرے اور کوئی شک نہیں ڈاکٹر صاحب سرتاپا درد اور مجسم آرزو ہیں، اس لئے قدرت کے ہر منظر سے ہم آغوش ہونے کے لئے بے تاب ہیں، ان کا دردِ عشق، جزیرہ، سسلی، تصویرِ درد، پیامِ عشق، محاصرۂ ادرنہ، مسلمان، شمع اور ترانۂ ملی سے بخوبی ظاہر ہو سکتا ہے، البتہ بوس وکنار اور ہم آغوشی کے تفصیلی مناظر ضرور موجود نہیں ہیں، اور میرے خیال سے ایک مہذب اور مصلح قوم شاعر کا یہ فرضِ اولین ہے کہ رکاکت وابتذال سے خود بھی بچے اور دوسروں کو بھی بچائے اور اگر سر محمد اقبال صاحب اس عمر میں حکیم صاحب کے اس طبی مشورہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں تو کیا کہنا۔" (۲۹)

فروری اور مارچ ۱۹۳۰ء کے معارف میں نصیر الدین احمد ہاشمی صاحب کا ایک مقالہ

’’ولی کا غیر مطبوعہ کلام‘‘ کے عنوان سے شائع ہوا ہے، اس زمانے کے لحاظ سے یہ مقالہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اس لئے درج ذیل سطور میں اس کا ایک مختصر سا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے، یہ مقالہ جس زمانے میں تحریر کیا گیا ہے اس سے کچھ قبل انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے ولی کا کلیات شائع ہو چکا تھا جو ان کے متعدد مخطوطوں سے مقابلہ کرنے کے بعد مرتب کیا گیا تھا نصیر الدین ہاشمی صاحب کے نزدیک اس کلیات کو مرتب کرنے کے سلسلے میں مرتب کلیات نے برطانیہ میں محفوظ ان مخطوطات سے استفادہ نہیں کیا ہے جن کی تعداد پندرہ ہے، نصیر الدین ہاشمی صاحب نے یہ اطلاع فراہم کرنے کے بعد ہر نسخہ کا مناسب تعارف کرایا ہے اور بتلایا ہے کہ انڈیا آفس میں ایک ایسا مخطوطہ بھی موجود ہے جو ولی کی زندگی (۱۱۴۴ھ) میں تحریر کیا گیا تھا، ان کے نزدیک ولی کے کلام کا یہی سب سے قدیم مخطوطہ ہے، تمام مخطوطات کا بھرپور تعارف کرانے کے بعد انھوں نے ان مخطوطات کا کلیات ولی سے مقابلہ کیا ہے اور یہ دکھلایا ہے کہ ولی کا بہت سا کلام انجمن کے کلیات میں شائع ہونے سے رہ گیا ہے، ہم دیگر اصناف سخن سے قطع نظر کرتے ہوئے ولی کی رباعیوں کے چند اشعار نمونے کے طور پر یہاں نقل کرتے ہیں:

شاخ گل ہے یا نہال راز ہے — سرو قد ہے یا سراپا ناز ہے
دودِ آہ شوق مشتاقاں نہیں — خط نہیں یہ حسن کا آغاز ہے

خوبرو کوں جمال لازم ہے — عشق کوں تب خیال لازم ہے
حسن کوں خط وخال لازم ہے — مسکین طوطی کوں فال لازم ہے (۳۰)

نصیر الدین ہاشمی صاحب کو بقول ان کے اتنا موقع نہ مل سکا کہ وہ درج بالا پندرہ مخطوطوں کی غزلوں کا کلیات ولی میں درج غزلوں سے مقابلہ کر کے نئی غزلیں دریافت کرتے، اس لئے اس مقالہ میں ولی کی غیر مطبوعہ غزلیں نہیں ملتیں البتہ اس کی جگہ پر انھوں نے یہ کام کیا ہے کہ کلیات ولی کی غزلوں کے بعض اشعار کا درج بالا مخطوطوں کے اشعار سے مقابلہ کر کے ’’اختلاف اشعار‘‘ پر بھی روشنی ڈالی ہے، جس سے اس ضرورت کا احساس ہوتا ہے کہ ولی کا کلیات پھر سے مرتب ہونا چاہیے۔

۱۹۳۰ء کے معارف کے بعد اب ہم ۱۹۴۵ء کے معارف کی جلد پر ایک نظر ڈالتے ہیں، اس سال کے پہلے ششماہے میں مرزا احسان احمد بیگ صاحب کا ایک مقالہ ''عرفانیات فانی'' کے عنوان سے مارچ، اپریل اور مئی کے معارف میں شائع ہوا ہے جس میں فانی کے کلام پر بڑے ہی سخت انداز میں گرفت کی گئی ہے، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے فانی کا مجموعۂ کلام شائع کیا تھا جس کو مرزا صاحب مرحوم نے انجمن کی ایک قابل قدر خدمت قرار دیا ہے لیکن ان کو ارباب انجمن سے شکایت ہے کہ اس مجموعہ میں غزلوں کی ترتیب ردیف وار کیوں رکھی گئی ہے؟ ایسا کرنے کی وجہ سے شاعر کی شاعری کا ارتقا پردۂ اخفا میں چلا جاتا ہے اور یہ معلوم کرنا ناممکن ہو جاتا ہے کہ ابتدا میں شاعر کے کلام کا رنگ کیا تھا اور اس میں رفتہ رفتہ کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں، مرزا صاحب کو انجمن سے دوسری شکایت یہ ہے کہ اس نے فانی کے سارے کے سارے کلام کو بغیر کسی انتخاب کے شائع کر دیا ہے جس کی وجہ سے خس و خاشاک کے انبار میں جواہر پاروں کی روشنی بھی گم ہو کر رہ گئی ہے۔

مرزا صاحب کے اس مقالہ پر کچھ عرض کرنے سے پہلے ہم یہ یاد دلانا مناسب سمجھتے ہیں کہ مرزا صاحب نشاطیہ رنگ تغزل کے دلدادہ تھے، غالباً یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جگر کا پہلا مجموعۂ کلام ''داغ جگر'' اپنے مقدمہ کے ساتھ اس وقت شائع کیا جب جگر ادبی دنیا میں نووارد کی حیثیت رکھتے تھے، علاوہ بریں مرزا صاحب نے اصغر کے پہلے مجموعۂ کلام ''نشاط روح'' پر جو مقدمہ لکھا ہے وہ بھی اس بات کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہ کس نوع کی شاعری کے دلدادہ تھے، مزید براں بعض وجوہ کی بنا پر ان کو لکھنؤ کے دبستان شاعری سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ لکھنؤ کے رنگ کلام پر چیں بہ جبیں ہوتے تھے تو بے جا نہ ہوگا، فانی کے کلام کا عام رنگ نشاطیہ نہیں ہے لکھنؤ میں کچھ عرصے تک رہنے کی وجہ سے ان کے کلام میں بھی لکھنؤ کے دبستان شاعری کے بعض اجزا کچھ غزلوں میں نمایاں ہو گئے ہیں، اسی لئے مرزا صاحب نے فانی کے اشعار پر بہت سخت الفاظ میں تنقید کرتے ہوئے ان کی شاعری کے بیشتر حصے کو ناقابل اعتنا ٹھہرایا ہے، ہماری بات کی تصدیق مرزا صاحب کے درج ذیل جملوں سے ہو سکے گی:

> ''فانی کو قدرت نے بے شبہ شاعرانہ دل و دماغ عطا کیا تھا، ان کی نگاہ بھی سطحی اور عامیانہ نہ تھی لیکن ان کی سب سے بڑی بدنصیبی لکھنؤ کا قیام تھا، جس کی وجہ سے ان کے

قالب سخن میں زندگی کی روح پیدا نہ ہوسکی اور گریہ وزاری میں وہ اس طرح محو ہوئے کہ ان کو عشق کی سرور آفرینیوں کا کبھی خیال تک نہ آیا، چنانچہ ان کی غزلوں میں لکھنویت کا یہ خاص رنگ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔" (۳۱)

مرزا صاحب کے مقالے کو پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مرزا صاحب اور فانی کا جو فکری اختلاف ہے وہ نظریاتی ہے، مرزا صاحب کو فانی کے اشعار میں نہ تو ایک زندہ روح کی آتش فشانیاں نظر آتی ہیں اور نہ ہی وہ ہمارے قلب ونگاہ کو ذوق ولذت کی دعوت دے سکتے ہیں لیکن پھر بھی بقول مرزا صاحب ان کو فانی سے کوئی شکایت نہیں کیوں کہ عشق کے بارِ غم کا متحمل ہر شخص نہیں ہوسکتا، اس کے لئے جوہر قابل درکار ہے جو اس کی اندرونی لذت وکشش کا احساس کرسکے، مرزا صاحب نے فانی کے درج ذیل اشعار۔

دم بہ خود سکتہ کا عالم ، مردنی چھائی ہوئی
رنگ میری زندگی کا میری میت پر کھلا

جو سوز محبت سے ہوا سرد وہ دل ہوں
وہ شمع ہوں جس کو پر پروانہ بجھادے

نامرادی حد سے گزری حال فانی کچھ نہ پوچھ
ہر نفس سے اک جنازہ آہ بے تاثیر کا

تو کہاں تھی اے اجل اے نامرادوں کی مراد
مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کئے

نقل کر کے یہ تبصرہ فرمایا ہے:

"لیکن اگر وجدان سلیم کے انوار سے ان کی چشم بصیرت روشن ہوتی تو یہی غم کدۂ حیات ان کو شبستان عیش نظر آتا اور سوز محبت ان کے ہر بُن مُو کو برق سر طور کی شرر افشانیوں کا گہوارہ بنادیتا، اور عشق کی انہی ناکامیوں میں ان کو وہ سرور حاصل ہوتا کہ ان کی ہر موج نفس موج صہبا بن جاتی، اور پھر نہ کبھی ان کو چارہ ساز وسامان کا شرمندۂ احسان ہونا پڑتا نہ کبھی ان کی آنکھوں سے زرد آنسو ٹپکتے اور نہ ہی کبھی ہجوم غم سے گھبرا کر موت کے لئے

دعائیں مانگتے، بلکہ وہ ایک ایسے عالم میں پہنچ جاتے جس کا ہر گوشہ زندگی کے سوز و تپش سے آتش بجاں اور جس کا ہر منظر ذوق نامحدود کی تابانیوں سے معمور نظر آتا اور بجائے یاس و حسرت کے ولولہ شکن نوحوں کے ہم ان کی زبان سے عشق کا یہ نعرۂ مستانہ سنتے۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے (۳۲)

مرزا صاحب نے اپنے مقالے میں اصغر کا کلام بکثرت نقل کیا ہے جس کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''میں نے اس تنقید کے دوران اکثر اصغر مرحوم کے اشعار نقل کئے ہیں جس سے شاید ناظرین کو یہ گمان ہو کہ میں فانی کا ان سے مقابلہ کر رہا ہوں حالانکہ یہ میری ہرگز نیت نہیں ہے، ان مثالوں سے صرف یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ فانی نے تغزل کا جو نمونہ پیش کیا ہے، اس میں قلب و روح کے لئے ذوق و لذت کا سامان بہت کم ہے اور اس میں بیشتر صرف قدیم رنگ سخن کی تقلید ہے، جس میں حسن و عشق کی بلند اور لطیف اداؤں کی جھلک بہت کم نظر آتی ہے اور اس لئے ہمارے نزدیک تغزل کی معنوی حیثیت میں کوئی قابل قدر اضافہ نہیں ہوتا اور فانی کی چشم یاس کی اشک فشانی اور حسرت زدہ دل کی افسردگی سے عشق کی حرارت و گرمی، جذبات محبت کی بلندی و پاکیزگی اور اس کی ساری لطیف روحانی کیفیتیں جو تغزل کا اصل سرمایۂ خمیر ہیں بجھ کر رہ گئی ہیں، ممکن ہے فانی کی یہ ادائے غم گساری سوگوار طبقوں کو کسی قدر خوشنما معلوم ہوتی ہو، لیکن افسوس ہے کہ غزل کی بزم کیف میں اس کی گنجائش نہیں، وہ ایک شرارِ معنوی ہے جس کے رقص نورانی سے قلب و روح کی تمام گہرائیاں دفعتاً جگمگا اٹھتی ہیں اور زندگی کا حقیقی جلوۂ بہار چشم بصیرت کے سامنے بے نقاب ہو جاتا ہے۔'' (۳۳)

مرزا صاحب نے فانی کے کلام کا اتنی سختی سے جو محاکمہ کیا ہے اس کا ایک اور سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے ناقدین ان کو فلسفی شاعر قرار دیتے تھے، مرزا صاحب کے نزدیک ''غزل گوئی کے لئے فلسفہ ضروری نہیں کیوں کہ غزل کا تعلق دماغ سے نہیں دل سے ہے۔'' در پردہ اس

کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ جس غزل کا تعلق دماغ سے ہوگا وہ حقیقی اور اعلیٰ غزل نہ بن سکے گی، دل ودماغ کی یہ ثنویت ایک افسانۂ پارینہ ہو چکی ہے اور اس پر مزید خامہ فرسائی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تاہم مرزا صاحب کے اصل خیالات واضح کرنے کے لئے ان کے درج ذیل اقتباس کا مطالعہ کافی ہوگا:

> ''کہا جاتا ہے کہ فانی فلسفہ لکھتے ہیں، ممکن ہے، یہ ایک حد تک صحیح ہو لیکن ہمارے نزدیک غزل کے لئے فلسفہ ضروری نہیں، کیوں کہ غزل کا تعلق دماغ سے نہیں بلکہ دل سے ہے، اس لئے اس کی اصلی روح جذبات ہیں جن کے بغیر غزل ایک پھول ہے جس میں نشہ نہیں نغمہ ہے، جس میں سرور نہیں راکھ کا ایک ڈھیر ہے، جس میں کوئی تپش نہیں، فانی کی غزلوں کا بعینہ یہی عالم ہے، جن کو پڑھ کر بجائے مستی و بیداری کے قلب و روح پر سکون مرگ طاری ہونے لگتا ہے۔'' (۳۴)

مرزا صاحب کو فانی کے ''فلسفیانہ'' خیالات میں کوئی خاص عمق یا ندرت وجدت محسوس نہیں ہوتی حتیٰ کہ ان اشعار میں بھی۔

مفہوم کائنات تمہارے سوا نہیں
تم چھپ گئے نظر سے تو سارا جہاں نہ تھا (۳۵)

اک حق کے سوا کوئی ہستی ہی نہ تھی یارب
یوں میرے سر آنکھوں پر تمیز حق و باطل (۳۶)

میں ہوں اک مرکز ہنگامۂ ہوش ورم ہوش
دل اگر عالم مستی ہے تو سر عالم ہوش (۳۷)

بے خودی مایۂ طوفان خودی ہے یعنی
محرم جلوۂ اسرار ہے نامحرم ہوش

مظہر ہستی وخلاق عدم ہے مری ذات
کچھ نہ تھا ورنہ بجز سلسلۂ برہم ہوش

مرزا صاحب نے اپنے اس تنقیدی مقالے میں فانی کی زبان پر بھی گرفت کی ہے اور ان

کی بعض فارسی تراکیب مثلاً محشرِ سکوت، گریۂ حیراں، سکوت برہم اور عشرتِ تجلی پر بھی اعتراض کیا ہے، علاوہ بریں انھوں نے فانی کے درج ذیل اشعار کی تراکیب پر اپنی ناگواری کا اظہار کیا ہے۔

ہوش سے احتراز کر فاش نہ غم کا راز کر
دغدغۂ حساب کیوں شکوۂ روز گار کیا (۳۸)

ہوش کا سرمایہ وحشت کے سوا ممکن نہیں
عالم اک مجموعۂ ذراتِ صحرا بیز ہے (۳۹)

کچھ شرحِ بے خودی ہے کچھ ہوش کا فسانہ
یہ بے حسی جو شاید تنقیدِ زندگی ہے (۴۰)

فانی کے کلام کی انتہائی سخت تنقید کرنے کے باوجود انھوں نے ان کے اشعار کو خوبیوں سے بالکل معرا قرار نہیں دیا ہے، اس ضمن میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

''اگرچہ ہمارے معیارِ تغزل پر فانی کا کلام پورا نہیں اترتا، تاہم اس کو خوبیوں سے بالکل معرا قرار دینا سخت ناانصافی ہوگی، فانی کو قدرت نے جو فلسفیانہ نظر اور شاعرانہ دماغ عطا کیا تھا، اس سے اردو تغزل کی تہذیب و ترقی کی بہت کچھ بجا طور پر توقع ہو سکتی تھی لیکن افسوس ہے کہ وہ گردوپیش کے خارجی حالات کی ناخوشگواری سے اس درجہ متاثر اور افسردہ ہوئے کہ ان کا دستِ طلب سازِ محبت کے پردہ ہائے آتشیں کو چھیڑنے کی جرأت نہ کر سکا، تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کا غم کدہ کبھی کبھی حسنِ تخیل کی شعاعوں سے بھی چمک اٹھتا ہے اور ایسے اشعار بھی ان کے قلم سے بے ساختہ نکل جاتے ہیں جو عام غزل گو شعراء کی دسترس سے باہر ہیں، بطور نمونہ کے چند اشعار اہلِ ذوق کی ضیافتِ طبع کے لئے ہم نقل کرتے ہیں جن سے بخوبی اندازہ ہوگا کہ فانی کی نگاہ یکسر عامیانہ نہ تھی۔'' (۴۱)

مرزا صاحب نے فانی کے جو اشعار پسند کئے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

اٹھ اے نگاہِ شوق اٹھ متاعِ جاں لئے ہوئے
وہ دامنِ نگاہ میں ہیں بجلیاں لئے ہوئے (۴۲)

ترے کرم سے کیا سماں ہے عالم گناہ کا
سیاہیاں امید کی تجلیاں لئے ہوئے (۴۳)

کیفیت نگاہ سرور آفریں نہ پوچھ
شبنم کو جس نے بادۂ عرفاں بنادیا (۴۴)

لطف حیات بے خلشِ مدعا کہاں
یعنی بقدر تلخیِ صہبا سرور تھا (۴۵)

سرکار محبت میں خبر بے ادبی ہے
اے نشۂ دیوانگی ہوش اتر جا (۴۶)

ہم کو ان سطور میں مرزا صاحب کے مقالہ پر کوئی تنقیدی محاکمہ کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ معارف کے دور اول میں اردو ادب سے متعلق کتنے مفصل اور مدلل مقالات اس میں شائع ہوا کرتے تھے جو قارئین کی ذہنی تربیت کرتے، اب ہم معارف کے دور دوم کا مطالعہ پیش کرتے ہیں۔

سید صاحب کے بھوپال بعد ازاں پاکستان جانے کے بعد معارف کی ترتیب کا کام مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی انجام دیتے، سید صاحب جب تک بھوپال میں رہے وہ وہیں سے اپنے شذرات لکھ کر بھیج دیا کرتے، ان کے پاکستان جانے کے بعد یہ سلسلہ برقرار نہ رہ سکا لیکن ابھی تک معارف کی لوح پر سید صاحب کا نام مدیر کی حیثیت سے درج ہوتا، سید صاحب نے جب پاکستان میں رہ جانے کا فیصلہ کرلیا تو دارالمصنفین کی انتظامیہ نے شاہ معین الدین احمد ندوی کو ناظم علمی مقرر کیا اور اب معارف کی لوح پر سید صاحب کے بجائے ان کا نام شائع ہونے لگا، یہ معارف کی اشاعت کا دوسرا دور ہے۔

سید صاحب محقق، ادیب، مورخ اور متکلم ہونے کے ساتھ ساتھ عملی سیاست میں بھی دلچسپی لیتے تھے، جس کی وجہ سے ان کو خاصے سفر بھی کرنے پڑتے، ان کا ایک فائدہ یہ ہوتا کہ سید صاحب اپنے شذرات میں ان اسفار کا جو حاصل ہوتا اس کو بھی لکھ دیا کرتے، یہی وجہ ہے کہ ان کے شذرات میں جو تنوع ہے وہ معارف کے دوسرے اور تیسرے دور میں برقرار نہیں رہ سکا، شاہ صاحب کو عملی

سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ سفر پر گوشہ نشینی اور عزلت کو ترجیح دیتے، ان کی عمر کے آخری بیس سال تو ایسے گزرے ہیں کہ ناظم دارالمصنفین کی حیثیت سے وہ جن جن اداروں اور کمیٹیوں کے رکن تھے ان سب جگہوں پر انھوں نے سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کو نامزد کروادیا تھا، خود شاید ہی کسی انجمن کے جلسہ میں شرکت کرتے، ان تمام باتوں کے باوجود شاہ صاحب اپنے معاشرہ کے بدلتے ہوئے حالات کا مطالعہ کیا کرتے اور اس مطالعے کے نتیجے میں ان پر جو بھی تاثر قائم ہوتا اس کو بلاتکلف معارف کے شذرات میں لکھ دیا کرتے تھے۔

ہم اپنے مطالعے کی ابتدا ۱۹۵۲ء کے شذرات سے کرتے ہیں، یہ وہی زمانہ ہے جب شاہ صاحب کو معارف کی ادارت سنبھالے دو برس کا عرصہ گزرا تھا، اس مطالعہ سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکے گا کہ شاہ صاحب نے اپنے ابتدائی دور میں کس انداز کے شذرات لکھے اور بعد میں ان میں کس قدر اور کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔

مئی ۱۹۵۲ء کے شذرات کا نصف حصہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے ذکر خیر کے لئے وقف ہے، اسی زمانے میں جامعہ عثمانیہ کے اردو میڈیم کو ختم کر کے اس کو ہندی میڈیم کی یونیورسٹی بنادیا گیا تھا، ابھی تقسیم ہند کا زخم تازہ تھا جو لوگ اس حادثہ کا شکار ہوئے تھے وہ ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ یہ خبر ان پر بجلی بن کر گری کہ جامعہ عثمانیہ کا اصل کردار یعنی اس کا اردو میڈیم ہونا ختم کردیا گیا ہے، ہندوستانی مسلمانوں کے لئے یہ وہ زمانہ تھا جب ان کا انتہائی ''دریدہ دہن'' نمایندہ بھی حالات کی نامساعدت کی وجہ سے چباچبا کر باتیں کرتا، شاہ صاحب نے اس دور میں بھی بڑی جرأت سے کام لیتے ہوئے اپنے احساسات وخیالات معارف کے صفحات پر پیش کردیے جو درج ذیل ہیں:

''جامعہ عثمانیہ کے ہندی یونیورسٹی بنائے جانے کی خبر عرصہ سے گرم تھی، بالآخر یہ حادثہ ہوکر رہا، اب اس کا انتظام مرکزی حکومت کے ہاتھوں میں آجائے گا اور اس کا ذریعہ تعلیم ہندی زبان ہوگی، ہندوستان کا پورا نظام تعلیم ہی ہندیایا جارہا ہے اور رفتہ رفتہ تمام یونیورسٹیوں کی تعلیمی زبان ہندی ہوجائے گی، اردو کی یونیورسٹی صرف ایک جامعہ عثمانیہ تھی، اگر حکومت اس کو باقی رہنے دیتی تو اس کا کیا بگڑتا اور اس سے ہندی کو کیا نقصان پہنچتا مگر اردو دشمنی کو اتنا بھی گوارا نہ ہوا اور اردو کی اس تنہا یونیورسٹی کو بھی مٹادیا گیا۔

صبح تک تو نے نہ چھوڑی وہ بھی اے باد صبا
یادگار شمع تھی کل تک جو پروانے کی خاک

جامعہ عثمانیہ بڑی ریاضت کا پھل اور ملکی زبان میں تعلیم کا ایسا کامیاب تجربہ تھا، جس کا اعتراف یورپ کی یونیورسٹیوں تک کو کرنا پڑا، اس کا عظیم الشان اور بیش قیمت علمی ذخیرہ جو کروڑوں روپئے کے صرف اور بڑے بڑے فضلا اور اصحاب علم وکمال کی برسوں کی محنت اور جانکاہی کا نتیجہ تھا، اس طرح چشم زدن میں خاک میں ملا دیا گیا، اب ردی کے سوا کس کام میں آئے گا، اس لئے یہ واقعہ ایسا دردناک علمی حادثہ ہے جو نہ صرف اردو دشمنی بلکہ علم وتہذیب سے بھی دشمنی کا ثبوت ہے۔

پرانے زمانے کے بعض فاتحوں کو آج صرف اس لئے غارت گر اور دشمن علم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے کہ انھوں نے مفتوح قوموں کے علمی ذخیروں اور تہذیب وتمدن کو مٹایا تھا، کیا جامعہ عثمانیہ کی یہ بربادی اس سے کم ہے بلکہ ان میں سے کچھ ایسے بھی نکل آتے تھے جو مفتوح قوموں کے علوم سے فائدہ اٹھانے کے لئے ان کو محفوظ رکھتے تھے، مگر ہماری حکومت کا کارنامہ ان غارت گروں سے بھی بڑھ گیا اور اس حکومت کے ہاتھوں انجام پایا جو جمہوری اور سیکولر کہلاتی ہے، جامعہ عثمانیہ کو ختم کر دینا تو آسان ہے مگر تاریخ اس واقعہ کو فراموش نہ کرے گی اور آئندہ نسلیں اس علم نوازی کو عبرت کے ساتھ یاد کرتی رہیں گی۔(۴۷)

اب ہر ماہ شذرات لکھتے لکھتے شاہ صاحب کا قلم منجھ چکا تھا اور وہ تلخ سے تلخ بات کو انتہائی خوشگوار انداز میں کہہ جانے پر حاوی ہو گئے تھے، ہمارے سامنے اس وقت اپریل ۱۹۵۹ء کے شذرات ہیں، یہ وہ زمانہ ہے جب بھوپال اور مبارک پور (اعظم گڑھ) کے تباہ کن فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے تھے اور مسلمانوں کی جان ومال کا جو اتلاف ہونا تھا وہ ہو چکا تھا، اس موقع پر ہندوستانی مسلمانوں کی پوزیشن پر نظر ڈالتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس وقت ہندوستان کے مسلمان جس نازک پوزیشن میں ہیں اس میں وہ اپنی طرف سے فساد کی ابتدا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے، وہ اقلیت میں ہیں، عملاً ان کی حیثیت محکوم کی ہے، فرقہ پرست جماعتوں کے علاوہ حکومت کے عہدہ داروں میں بھی فرقہ پرستی سرایت کر گئی ہے، ان کی طرف سے فسادیوں کی ہمت افزائی ہوتی ہے اور جہاں بھی فساد ہوتا ہے مسلمان تباہ و برباد کئے جاتے ہیں، ان ہی کا جانی و مالی نقصان ہوتا ہے اور الٹے ان ہی کو قید و بند کی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں، ان پر پاکستان سے ساز باز کا الزام لگا کر بدنام کیا جاتا ہے، ان حالات میں وہ فساد کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے اور ایسے موقعوں پر دب جاتے ہیں، مگر جب کبھی ان کے صبر و تحمل کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اس وقت وہ بھی بدرجۂ مجبوری مقابلہ میں آ جاتے ہیں، بھوپال اور مبارک پور وغیرہ میں ان ہی حالات میں فساد ہوئے اور مبارک پور میں تو معمولی جھڑپ کے بعد معاملہ ختم ہو گیا تھا مگر اس کے بعد پولیس فریق بن گئی، اور اس نے مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے اس کی تفصیل اخبارات میں آچکی ہے۔'' (۴۸)

دو فرقوں کی آپسی جنگ میں کسی سرکاری ایجنسی کا فریق بن جانا نہ صرف انتہائی مذموم ہے بلکہ اس حقیقت کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ خود حکومت کی گرفت اپنی ایجنسیوں پر ایسی نہیں ہے کہ یہ ایجنسیاں اس کے مقصد سے سرمو انحراف نہ کریں، ایسی صورت حال کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ حکومت کی ایک ایجنسی کی مذموم حرکت کی وجہ سے متاثرہ فرقہ حکومت سے بدظن ہو جاتا ہے، جس کا اثر الیکشن پر بھی پڑتا ہے۔ عقل و فہم رکھنے والی حکومتیں اپنی ان تمام ایجنسیوں کو جو کہ قوانین نافذ کرتی ہیں شکنجے میں رکھتی ہیں، ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہماری حکومت کی ایجنسیاں اس کے احکامات کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتی ہیں اور حکومت خاموش تماشائی بنی رہتی ہے، اس تلخ حقیقت کا شاہ صاحب کو شدت سے احساس تھا، اس لئے انھوں نے معارف کے شذرات میں واشگاف الفاظ میں اپنے احساسات کو ظاہر کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

''یہ تنہا مبارک پور اور بھوپال کا معاملہ نہیں ہے، وہ تو کسی نہ کسی شکل میں ختم ہو جائے گا، بلکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آیندہ پر امن اور باعزت زندگی کا مستقل سوال ہے

انھیں ایک محکوم اور ذلیل رعایا بن کر رہنا پڑے گا یا باعزت اقلیت کی حیثیت سے، اگر ہندوستان کی حکومت واقعی جمہوری اور سیکولر ہے تو مسلمانوں کے تحفظ اور ان کی باعزت زندگی کی ذمہ داری اس پر عاید ہوتی ہے جسے وہ آسانی سے پورا کر سکتی ہے، اگر حکومت کے عہدہ دار اور امن وقانون کے محافظ فرقہ پروری میں مبتلا نہ ہو جائیں اور اپنے فرائض دیانت داری سے ادا کریں تو کبھی فساد نہیں ہو سکتا، اگر اتفاقیہ ہو بھی جائے تو زیادہ نہیں بڑھ سکتا اور جس فساد میں ان کی غفلت اور فرقہ پروری ثابت ہو ان کو پوری سزا دی جائے، اگر دو چار کو بھی سزا مل جائے تو بڑی حد تک فسادات کا خاتمہ ہو جائے گا، انگریزوں کے زمانہ میں حکام کی فرقہ پروری، غفلت اور ان کے علاقہ میں فساد سے ان کا رکارڈ خراب ہو جاتا تھا، اس لئے جب تک خود حکومت نہیں چاہتی تھی فساد نہیں ہو سکتا تھا، اگر اتفاقیہ ہو بھی جاتا تھا تو اس پر آسانی سے قابو حاصل کر لیا جاتا تھا، اگر آج بھی اس پر عمل کیا جائے تو بڑی حد تک فساد کا خاتمہ ہو سکتا ہے، مگر اس آزادی کے دور میں تو حکام کو بھی آزادی مل گئی ہے، ان سے کوئی مواخذہ نہیں ہوتا، اس لئے ان کو اور بھی کھیل کھیلنے کا موقع مل گیا ہے۔" (۴۹)

یہاں تک لکھنے کے بعد ان کو احساس ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان ان کی تحریر سے یہ نتیجہ اخذ کر لیں کہ وہ اب ہندوستان میں کبھی بھی پنپ نہ سکیں گے، اس لئے شاہ صاحب اپنے شذرات کا اختتام ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"مسلمانوں کو ان واقعات سے ہراساں اور بددل نہ ہونا چاہئے، وہ اس سے بھی بڑے مصائب جھیل چکے ہیں، یہ وقت بھی گزر جائے گا، چار کروڑ مسلمان کو ذلیل بنا کر رکھنا آسان نہیں ہے، ان کو ذلیل کرنے والے خود دنیا کی نگاہوں میں رسوا ہوں گے اور اگر مسلمانوں میں صلاحیت ہے تو وہ ہندوستان میں اپنا اصل مقام حاصل کر کے رہیں گے، مگر مسلمانوں کے صاحب فکر طبقہ کو بہر حال یہ سوچنا ہے کہ آخر یہ زندگی کب تک؟ وہ محض حکومت کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتے اور دس سال کے تجربہ کے بعد اس پر بھروسہ کرنا سخت غلطی ہے، اب کانگریس کی اصل روح اور اس کے ساتھ اس کا نصب العین ختم ہو چکا، اب اس کا مقصد محض اپنی حکومت کی بقا واستحکام ہے، خواہ وہ کسی ذریعہ سے ہو، اس سے

کہیں بہتر دوسری ترقی پسند پارٹیاں ہیں، اس لئے مسلمانوں کو خود اپنی تنظیم اور طاقت پر بھروسہ کرنا ہے، اس کے بغیر وہ ہندوستان میں زندہ نہیں رہ سکتے، اس کے لئے مسلمان رہنما جو شکلیں بھی تجویز کریں، جب مسلمانوں میں قوت اور تنظیم ہوگی اس وقت حکومت بھی ان کو ماننے پر مجبور ہوگی، ورنہ ؎

یہ مفتی تقدیر کا فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات" (۵۰)

اب ہم ۱۹۶۵ء کے معارف کی فائل پر نظر ڈالتے ہیں، شاہ صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر تھے، وہ بھی اس جلسہ میں شریک تھے جس کا طلبہ نے گھیراؤ کیا تھا اور بعد ازاں اس زمانے کے وائس چانسلر علی یاور جنگ صاحب پر جسمانی حملہ بھی ہوا تھا، اس واقعہ کے سلسلے میں شاہ صاحب نے اپنا پہلا تاثر مئی ۱۹۶۵ء کے معارف میں ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"مسلم یونیورسٹی کے طلبہ اپنے ضبط ونظم اور تہذیب وشائستگی میں دوسری یونیورسٹیوں کے طلبہ کے لئے نمونہ تھے، تاہم یونیورسٹیوں میں آئے دن ہنگامے ہوتے رہتے تھے لیکن مسلم یونیورسٹی ان سے بالکل پاک تھی، مگر ۲۵/اپریل کی کورٹ کی میٹنگ میں طلبہ نے جو ہنگامہ برپا کیا اس نے ان کی پوری تاریخ پر پانی پھیر دیا، انھوں نے وائس چانسلر کے ساتھ جو سلوک کیا اس کی مثال نہیں ملتی، اس کی جس قدر بھی مذمت کی جائے کم ہے، حالانکہ یہ وہی طلبہ ہیں جنھوں نے اپنے سابق وائس چانسلر بدرالدین طیب جی کو جس محبت، عزت اور شان سے یونیورسٹی سے رخصت کیا تھا، اس کی مثال بھی نہیں ہے۔

اس واقعہ میں یونیورسٹی کے ذمہ داروں سے بھی غلطیاں ہوئیں، ورنہ اتنی سنگین صورت حال نہ پیش آتی، نئے وائس چانسلر نے پچھتر فی صدی کے قانون کو بدلنے میں عجلت سے کام لیا، اگر وہ کسی مصلحت سے اس کو بدلنا ہی چاہتے تھے تو اس کے لئے رفتہ رفتہ فضا ہموار کرنا چاہئے تھا، مگر آتے ہی انھوں نے اس کو بدل دیا اور اس فیصلہ پر اس سختی سے قائم رہے کہ طلبہ کے احتجاج کے باوجود اس پر نظر ثانی کرنے سے قطعی انکار کر دیا، یونیورسٹی

کے دوسرے ذمہ داروں سے یہ غلطی ہوئی کہ ان کو یا تو خود معاملہ کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہو سکا یا وہ وائس چانسلر کو سمجھانے کی جرأت نہ کر سکے، کورٹ کے جلسہ میں طلبہ کے ہجوم کے وقت بھی ان کو حسن تدبیر سے ٹھنڈا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی، اس میں شبہ نہیں کہ طلبہ کی شورش اتنی بڑھ گئی تھی کہ ان کو روکنا مشکل تھا لیکن یونیورسٹی کی روایت کے خلاف پولیس کی آمد نے ان کو اور زیادہ مشتعل کر دیا، پولیس نے یہ غلطی کی کہ طلبہ کو منتشر کرنے کے دوسرے ذرائع اختیار کئے بغیر گولی چلا دی اور یہ خبر اڑ گئی کہ دو طالب علم ہلاک ہو گئے، اس خبر نے ان کو آپے سے باہر کر دیا اور وہ ایسی حرکتیں کر گزرے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔" (۵۱)

طلبہ کے فعل کو ناروا قرار دینے کے ساتھ ہی ساتھ شاہ صاحب نے یونیورسٹی کے ذمہ داروں کی غلطیوں کو بھی واضح کیا ہے اور اس زمانے کے طلبہ نے انٹرنل طلبہ کے لئے پچھتر فی صدی نشستوں کو مخصوص کرنے کا جو مطالبہ کیا تھا انھوں نے اس کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے لکھا:

"پچھتر فی صدی کے مطالبہ کو بھی فرقہ واریت سے کوئی علاقہ نہیں ہے، ایک مسلم یونیورسٹی میں ایک تہائی سے زیادہ غیر مسلم طالب علم ہیں، وہ بھی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اب تعلیم اتنی بڑھ گئی ہے کہ یونیورسٹیوں میں طلبہ کو داخلہ نہیں ملتا، اس لئے تمام یونیورسٹیاں داخلہ میں اپنے طلبہ کو ترجیح دیتی ہیں، یہ بھی حقیقت ہے میڈیکل، انجینئرنگ اور پالیٹکنک میں اور دوسری یونیورسٹیوں میں مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے، ان کے لئے صرف مسلم یونیورسٹی رہ گئی ہے، اس لئے جس ترجیحی اصول پر تمام یونیورسٹیوں کا عمل ہے اگر مسلم یونیورسٹی نے اس کو قانونی شکل دے دی تو اس میں کون سی قباحت ہوگی جب کہ اس سے ہندو اور سکھ طلبہ بھی فائدہ اٹھاتے تھے اور انجینئرنگ اور پالیٹکنک میں ان کی تعداد ان کے تناسب سے کہیں زیادہ ہے۔" (۵۲)

اب ہم ۱۹۷۴ء کے معارف کی فائل پر نظر ڈالتے ہیں، یہ وہ زمانہ ہے جب شاہ صاحب کا آفتاب زندگی لب بام آ چکا تھا، اس لئے ان خیالات کو ان کے آخری خیالات کا درجہ حاصل ہے، ۱۹۷۴ء میں ہندوستان کو آزاد ہوئے ستائیس برسوں کا عرصہ گزر چکا تھا، پہلے تو فرقہ وارانہ فسادات

کے ذریعے فرقہ پرست قوتوں نے مسلمانوں کو اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی مگر جب اس میں ناکام رہے تو انھوں نے مسلمانوں کے تمدن پر حملے کرنے شروع کیے، اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی شعوری کوشش کی گئی کہ قرون وسطیٰ اور جنگ آزادی کی تاریخ لکھتے وقت مسلمانوں کی ایسی کریہہ تصویر کشی کی جائے کہ مسلمانوں کو اپنے وجود سے گھن آنے لگے، یہ حملہ بڑا ہی منظم تھا اور مختلف چور دروازوں سے مسلمانوں پر ضرب لگاتا، اس ضرب کاری میں بعض اوقات خاصے معقول اور غیر متعصب لوگ بھی شامل ہو جاتے، شاہ صاحب نے ان سازشوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے اگست ۱۹۷۴ء کے معارف میں یہ الفاظ لکھے:

> ''ہندوستان کی آزادی کے بعد سے ایک خاصے بڑے طبقہ میں یہ ذہنیت پیدا ہوگئی ہے کہ ہندوستان کے قرون وسطیٰ اور جنگ آزادی کی تاریخ سے مسلمانوں کا نام مٹا دیا جائے یا کم سے کم ان کی بڑی تاریک تصویر پیش کی جائے، چنانچہ اس سلسلہ میں مسلمانوں کے کارناموں اور ان کی قربانیوں کا ذکر اور ان کے ان لیڈروں کا نام تک مشکل سے آنے پاتا ہے جنھوں نے تحریک آزادی میں جان ڈالی تھی، حالانکہ انھوں نے اس زمانہ میں آزادی کا علم بلند کیا جب ہندوستان میں اس کا احساس بھی پیدا نہ ہوا تھا اور حضرت سید احمد شہیدؒ اور مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ کے وقت سے لے کر ہندوستان کی آزادی تک اس کا مسلسل سلسلہ قائم رہا، ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں اگرچہ ہندو مسلمان دونوں شریک تھے لیکن اس کے اصل قائد و رہنما مسلمان ہی تھے اور اس کا خمیازہ سب سے زیادہ ان ہی کو بھگتنا پڑا، ترک موالات کی تحریک میں بھی وہ پیش پیش تھے، اس راہ میں ان کی قربانیاں کسی سے کم نہیں ہیں، محض ہندوستان کی تقسیم کے الزام میں ان کے کارنامے فراموش نہیں کیے جا سکتے، پر یہ بھی ایک بحث طلب مسئلہ ہے کہ اس تقسیم کے حقیقی اسباب کیا تھے اور اس کی ذمہ داری کس پر ہے، محض مسلم لیگ کے نعرے سے اتنا بڑا انقلاب نہیں ہو سکتا تھا، اس نے تو صرف ان اسباب سے فائدہ اٹھایا، دوسرے لیگ کے علاوہ مسلمانوں کی دوسری تنظیمیں آخر تک تقسیم کے خلاف رہیں، اگر کانگریس نے جلد بازی سے کام نہ لیا ہوتا تو تقسیم کی نوبت نہ آتی اور اب تو خود منصف مزاج ہندو اہل قلم تک حقیقت

کے چہرہ سے پردہ ہٹا رہے ہیں۔"(۵۳)

اس صورت حال کی وجہ سے شاہ صاحب کا خیال تھا کہ خود مسلمانوں کو جنگ آزادی کی تاریخ لکھنی چاہیے، جس میں تاریخی دستاویزات کے ذریعے ہر ہر واقعے کی صحیح تصویر کشی ہو اور جس شخص نے جنگ آزادی کی راہ میں جتنی بھی قربانی دی ہو اس کو واشگاف الفاظ میں بیان کیا جائے تا کہ مسلمانوں کی نئی نسل اپنے اسلاف کے کارناموں سے واقف ہو سکے اور اس کے ساتھ ساتھ اہالیان ملک بھی ان حالات وواقعات سے آگاہ ہوتے رہیں، شاہ صاحب نے اس ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے لکھا:

"اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ خود مسلمانوں کو جنگ آزادی کی تاریخ لکھنی چاہیے اور اس میں مسلمانوں کا حصہ پوری طرح دکھانا چاہیے، اس کی ذمہ داری جامعہ ملیہ اور اس کے بعد مسلم یونیورسٹی پر عائد ہوتی ہے، جامعہ تو جنگ آزادی میں مسلمانوں کی شرکت کی زندہ یادگار ہے، اس کام کے لئے پروفیسر ہارون خاں شروانی، ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر خلیق احمد نظامی کی طرف نگاہ اٹھتی ہے، اول الذکر دونوں بزرگ جنگ آزادی کے عینی شاہد ہیں مگر اب وہ عمر کی اس منزل کو پہنچ گئے ہیں کہ خود اس کام کو انجام نہیں دے سکتے، لیکن ان کی نگرانی میں ہوسکتا ہے اور ادارۂ اسلام اور عصر جدید کے دائرے میں بھی یہ کام آجاتا ہے، خلیق احمد صاحب نظامی نامور صاحب علم وقلم اور پختہ کار مصنف ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان کے علمی ذوق کو پرووائس چانسلری کے چکر نے غارت کر دیا، ان کا اصلی مقام تعلیم وتدریس اور تالیف وتصنیف کی مسند تھی، چانسلری اور پرووائس چانسلری کا خارزار نہیں، مسلم یونیورسٹی کو وائس چانسلر بہت مل جائیں گے مگر خلیق احمد نظامی جیسا صاحب علم وقلم کا ملنا آسان نہیں، کاش وہ اس پر غور کرتے۔

تو بہار عالم دیگری زکجا بہ ایں چمن آمدی" (۵۴)

ابھی تک ہم نے جو کچھ تحریر کیا ہے اس سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ شاہ صاحب نے معارف کے شذرات میں سید صاحب کی روایت کو بڑی حد تک برقرار رکھا اور ان سے جہاں تک ہوسکا وہ شذرات کے ضمن میں ملکی اور ملی مسائل پر بھی لکھتے رہے۔

معارف کا سب سے دلچسپ عنوان اخبار علمیہ سید صاحب ہی کے زمانے سے چھپنا بند ہو گیا تھا، جس کی معارف کی طرف سے کوئی وجہ بیان نہیں کی گئی، ہمارا قیاس یہ ہے کہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کے علاوہ دار المصنّفین کے تمام انگریزی داں رفقا ایک ایک کر کے الگ ہو گئے تھے اس لئے یہ صورت حال پیش آئی، اب نہ ڈاکٹر عزیر صاحب تھے نہ نجیب اشرف ندوی صاحب اور نہ ہی ابوظفر ندوی، صباح الدین صاحب دوسرے دوسرے کاموں میں مشغول رہتے اس لئے وہ اس عنوان کو مرتب کرنے کا وقت نہ نکال پاتے رہے ہوں گے۔

آثار علمیہ وادبیہ کا عنوان یکسر ختم تو نہیں ہوا مگر اس میں ناغہ بہت ہونے لگا، مارچ ۱۹۵۹ء کے معارف میں ''خسرو'' کے عنوان سے مولانا سید سلیمان ندوی کی نومبر ۱۹۴۰ء کی ایک ریڈیو تقریر شائع کی گئی ہے، ریڈیو تقریر سننے والوں کے ذوق کو سامنے رکھ کر لکھی جاتی ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ اس میں ایسی باتوں سے بحث کی جائے جو عام فہم ہوں، سید صاحب نے بھی خسرو پر یہ تحریر لکھتے وقت اس بات کا خیال رکھا ہے مگر یہ تقریر اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں جا بجا ان کے مخصوص طرز فکر کے چھینٹے نظر آتے ہیں، اس تقریر میں سید صاحب نے خسرو کی جامعیت کو خاص طور سے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کی جامعیت کو نمایاں کرنے کے لئے سات نکات پیش کئے ہیں، اس تقریر کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے:

> ''غزل امیر کی خاص چیز ہے، سعدی نے غزل کو غزل بنایا اور امیر کی غزل گوئی حقیقت میں وہ سعدی کی شراب ہے جو امیر کے ہاں دوبارہ کھنچ کر اور تیز ہو گئی ہے، غزل کی جان درد، سوز و گداز، جذبات اور حسن و عشق کے دوسرے کاروبار ہیں، زبان سادہ، طرز ادا بے تکلف، بحریں چھوٹی، ترکیب میں الجھاؤ نہیں خصوصیت کے ساتھ شاعرانہ تلمیح میں صوفیا نہ حقیقتوں کی تعبیر امیر کی غزل گوئی کی مقبولیت کا راز ہے۔'' (۵۵)

جنوری ۱۹۶۵ء کے معارف میں اسی عنوان کے تحت مولانا احمد علی لاہوری کا ایک مقالہ نما خط جو سید صاحب کے نام تھا شائع کیا گیا ہے، یہ بہت اہم خط ہے جو سارا کا سارا ترجمۂ کلام پاک سے متعلق ہے، اس میں ضمناً مولانا عبیداللہ سندھی کا ذکر کیا گیا ہے، احمد علی لاہوری مرحوم، مولانا سندھی کے افکار و نظریات کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''یہ عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ مولانا سندھی مرحوم کے قبل از ہجرت جو خیالات تھے، جن کی بنیاد خالص کتاب وسنت پر تھی اور مسلک اسلاف سے نکلنا جرم عظیم سمجھتے تھے، میں فقط انھیں خیالات سے متاثر اور مستفید ہوں، بعد از ہجرت جو ان کے خیالات میں مذہباً یا سیاستاً تبدیلی آگئی تھی میں اس سے ہرگز متفق نہیں ہوا، حالانکہ وہ مجھے اپنا ہم خیال بنانے میں مصر تھے، اسی لئے وہ مجھ سے آخر دم تک ناراض رہے اور اسی مخالفت کے باعث بہت کچھ برا بھلا کہا کرتے تھے۔''(۵۶)

فروری ۱۹۶۵ء کے معارف میں اس عنوان سے عماد الملک سید حسن بلگرامی کے کچھ وہ خطوط شائع کیے گئے ہیں جو انھوں نے مولانا شبلی مرحوم کے نام لکھے تھے، سید حسن بلگرامی اپنے زمانے کے مشہور اور فعال شخصیت میں شمار کیے جاتے تھے، انھوں نے انگریزی زبان میں کلام پاک کے چند پاروں کا ترجمہ بھی کیا تھا، یہ تمام خطوط اسی ترجمے سے متعلق ہیں، سید حسن بلگرامی قدم قدم پر مولانا شبلی سے مدد لیتے اور خط کے ذریعے ان سے استفسار کرتے رہتے، درج ذیل خط سے ان کے انداز استفسار کا کچھ اندازہ لگایا جاسکے گا:

''میں اس وقت سورۂ بقرہ اور سورہ آل عمران کے ترجمہ پر نظر ثانی کر رہا ہوں، بعد نظر ثانی انشاء اللہ آپ کی خدمت میں راونہ کروں گا۔

میں دیکھتا ہوں کہ بار بار نظر ڈالنے کی ضرورت ہے، نظر ثانی نہیں بلکہ نظر عاشر بھی ہوتو بعض مقامات پر اطمینان نہیں ہوتا، دو مقام کا جو بظاہر نہایت آسان معلوم ہوتے ہیں، بطور نمونہ ذکر کرتا ہوں، سورہ فاتحہ میں غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ کا ترجمہ دو طرح سے ہوسکتا ہے، علٰی ھٰذا...... سورۂ بقرہ کی اول آیت کا ترجمہ دو طرح سے ہوسکتا ہے، ھٰذا کو مبتدا اور الکتاب کو خبر مان لیں تو ایک طور سے ترجمہ ہوگا، اور اگر ھٰذا الکتاب کو مبتدا خیال کریں تو ترجمہ بدل جائے گا، اسی قسم کے شکوک پیدا ہوتے ہیں، اکثر تو ایسے ہیں جن میں خود مفسرین میں اختلاف ہے، ایسی صورتوں میں کس کی ہدایت کی متابعت کی جائے۔''(۵۷)

صرف اسی ایک خط سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سید حسن بلگرامی کس طرح علامہ شبلی سے

مدد لیتے تھے، چونکہ یہ سارے کے سارے خطوط غیر مطبوعہ ہیں اس لئے ان کا چھپ جانا ان کے محفوظ ہو جانے کے مترادف ہے، اس عنوان کے تحت شاہ صاحب کے دورِ ادارت میں وہ تمام خطوط بھی شائع کردیے گئے ہیں جو ملک کے مقتدر حضرات نے سید صاحب کے نام وقتاً فوقتاً لکھے تھے، ان میں گاندھی جی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے سیاسی رہنماؤں کے بھی خطوط ہیں اور علامہ اقبال اور مولانا حالی جیسے شاعروں اور ادیبوں کے بھی، شاہ صاحب نے معارف کے پہلے دور کے اس عنوان کو اپنے دورِ ادارت میں بھی باقی رکھا اور ان سے جہاں تک ہوسکا انھوں نے ''علمی آثار'' کو تلاش کرکر کے معارف میں شائع کیا:

معارف کے دوسرے دور میں باب التقریظ والانتقاد کا عنوان گو باقی رہا مگر برائے نام بعض بعض سال تو ایسے بھی گزرے ہیں جس میں اس عنوان کے تحت کوئی تحریر شائع نہیں ہوئی، بہرحال ہم شاہ صاحب کے دور کی ایک تحریر کا مطالعہ درج ذیل سطور میں پیش کر رہے ہیں جو حسن اتفاق سے شاہ صاحب کی تحریر کردہ ہے۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی کی ایک کتاب ''جزء حجۃ الوداع ویلیہ جزء عمرات النبیؐ'' کے نام سے شائع ہوئی تھی جس پر شاہ صاحب نے جنوری ۱۹۷۱ء کے معارف میں اس عنوان کے تحت تفصیلی نظر ڈالی، انھوں نے اپنی تحریر کی ابتدا ان الفاظ سے کی ہے:

> ''حج اسلام کا بنیادی رکن اور ملت ابراہیمی کی عظیم الشان یادگار ہے، دوسرے ارکان وعبادات کی طرح اس کا بھی حدیث وفقہ کی کتابوں میں مستقل باب موجود ہے، گو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بھر میں صرف ایک ہی دفعہ فریضۂ حج ادا کیا، مگر آپ کے حج مبارک کی تفصیلات کے متعلق جو احادیث وواقعات مروی ہیں ان میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، منکرین حدیث نے اس کو بھی احادیث میں طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا ہے جو ان کی عدم واقفیت اور قلت تدبر کا نتیجہ ہے، امام شافعیؒ نے اختلاف الحدیث اور امام خطابیؒ نے معالم میں اس کا جواب دیا ہے، سیر وتاریخ کی کتابوں میں بھی حجۃ الوداع کی تفصیل کے بیان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کے واقعات اور اس سے متعلقہ مباحث ومسائل میں احادیث کے فرق واختلاف کی نوعیت اور حقیقت پوری طرح بیان کردی گئی ہے، جس

سے حدیثوں کا تناقض رفع ہوگیا ہے اوران کے درمیان مکمل تطبیق ہوگئی ہے، علامہ ابن حزم وغیرہ نے حجۃ الوداع پر مستقل رسالے لکھے ہیں اور اردو میں سیرت النبیؐ جلد اول میں اس کا مفصل ذکر ہے۔'' (۵۸)

روایات کی اس کثرت اختلافات کی وجہ سے مولانا زکریا صاحب نے ان تمام احادیث کو جمع کر کے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے، شاہ صاحب نے مولانا کی اس کوشش کو ان الفاظ میں اجاگر کیا ہے:

''زیر نظر رسالہ حضرت شیخ الحدیث کے قلم کا تازہ ترین افادہ ہے، یہ دو جزوں پر مشتمل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج وعمرات کے متعلق مفصل اور محققانہ معلومات کا مستند ذخیرہ ہے، پہلے جز میں حجۃ الوداع کے واقعات کی تفصیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج مبارک کی پوری کیفیت اور مدینہ طیبہ سے روانگی سے واپسی تک کی روداد سفر اس طرح پیش کی گئی ہے کہ حج کے واقعات وکوائف کی تحقیق وتنقیح اور اس کی جملہ روایات پر بحث وتنقید بھی آگئی ہے اوران سے مستنبط مسائل مناسک اوران کے بارہ میں جمہور فقہا وائمہ مذاہب کے آراء واختلاف بھی واضح ہوگئے ہیں، اس ضمن میں روایات وواقعات کے تضاد اور مورخین وارباب سیر کے اختلافات واوہام کا بھی ازالہ کیا گیا ہے، جس سے حجۃ الوداع کا صحیح مرقع سامنے آجاتا ہے، دوسرے جز میں جو عمرات نبوی سے متعلق ہیں، پہلے عمرہ کی لغوی وشرعی معنی کی تحقیق، اس کی تعریف، اس کے ارکان، شرائط اور احکام وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمرات کی تعداد اوران سے متعلق تمام واقعات وروایات کی تحقیق وتنقید، ان سے مستنبط مسائل کی تشریح، فقہا کے اقوال اور روایات واحادیث اور مورخین وارباب سیر کے اختلافات پر فاضلانہ بحث کی گئی ہے اور آخر میں عمرہ سے متعلق بعض غلط روایات وحکایات کا جائزہ لیا گیا ہے اوران کی تردید کی گئی ہے۔'' (۵۹)

شاہ صاحب کی اس تحریر کو بلاشبہ تقریظ کے زمرہ میں شمار کیا جاسکتا ہے مگر جہاں تک انتقاد کا تعلق ہے وہ ''تقریظ'' کے مقابلے میں بڑی دبی زبان سے ادا کیا گیا ہے، اس کتاب پر انھوں نے

جو انتقاد کیا ہے اس کو سہو سے مرسوم کرتے ہوئے وہ بڑی خوبصورتی سے اپنی بات کہہ گئے ہیں، صرف اسی ایک تحریر سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دوسرے دور میں باب التقریظ والانتقاد کے عنوان سے اگر کبھی کچھ شائع بھی ہوتا تو اس میں تقریظ کا عنصر غالب رہتا اور انتقاد برائے نام ہوتا، جس سے اس باب کی افادیت یکسر کم ہو کر رہ گئی، اب ہم معارف کے دوسرے دور کے مقالات کا ایک جائزہ پیش کررہے ہیں:

معارف کے دوسرے دور میں اس کے پہلے دور کے بہت سے اہم اور صف اول کے لکھنے والے اپنا اپنا مشن پورا کر کے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، تاہم اس دوسرے دور میں بھی اردو کے بعض صف اول کے لکھنے والوں کا تعاون معارف کو حاصل رہا، جن میں شوکت سبزواری جعفر علی خان اثر، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر سید حسن، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر حمید اللہ اور مالک رام جیسے مقتدر اہل قلم کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں، دار المصنفین کے رفقا میں مولانا عبد السلام ندوی، سید صباح الدین عبد الرحمٰن اور مولانا مجیب اللہ ندوی کی علمی تحقیقات سے یہ رسالہ مزین رہتا، ان لوگوں کے تعاون کی وجہ سے معارف کا معیار اپنی جگہ برقرار رہا، ۱۹۵۲ء کے معارف کی فائل پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو پروفیسر نذیر احمد صاحب کا ایک انتہائی اہم مقالہ ہماری نظروں کے سامنے آتا ہے، جس کا عنوان ''اردو شہ پارے کی چند قابل توجہ فروگذاشتیں'' ہیں، پروفیسر صاحب موصوف نے اس مقالہ میں ڈاکٹر غلام محی الدین قادری زور کی کتاب ''اردو شہ پارے'' کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا ہے، اس مقالے کی ابتدا میں نذیر احمد صاحب نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ دکھنی زبان کے کارناموں کو اجاگر کرنے میں زور صاحب کا نمایاں حصہ ہے، اس اعتراف کے باوجود ان کے نزدیک ''اردو شہ پارے'' میں بعض ایسی فروگزاشتیں ہوگئی ہیں جو حقائق سے مطابقت نہیں رکھتیں، اس لئے ان کی تصحیح ہو جانی ضروری ہے۔

پروفیسر نذیر احمد صاحب کا یہ مقالہ خاصا طویل ہے ہم اس تحریر میں ان کے تمام مندرجات پر گفتگو کرنے سے قاصر ہیں، اس لئے نمونہ کے طور پر ان کے ایک ہی نکتہ کو نقل کررہے ہیں تاکہ ان کی تنقیدی و تحقیقی روش کا کچھ اندازہ ہو سکے، زور صاحب نے اردو شہ پارے میں تحریر فرمایا ہے:

''۱- ابراہیم عادل نے ارزو زبان کی جوسب سے اعلیٰ خدمت انجام دی ہے

اور جس کی وجہ سے اس کا نام اردو کے محسنوں کی فہرست میں سب سے اول آتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس نے گجراتی شاعروں اور عالموں کو بیجاپور میں آبسنے کی دعوت دی۔"

۲- ایسے نازک موقع پر ابراہیم نے نہایت عقلمندی اور فیاضی کا کام کیا، اس نے اپنے آدمیوں کو بیش بہا تحائف دے کر گجرات روانہ کیا تاکہ وہاں کے علماء و شعراء کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دیں، چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد گجرات کی ادبی عظمت کے پرچم کو بیجاپور میں لہراتا ہوا دیکھتے ہیں.........ان گجراتیوں کا اثر یہ ہوا کہ بعض مصنفین بھی گجراتی آمیز زبان کو گجری کے نام سے موسوم کرنے لگے۔"(۶۰)

زور صاحب کے اس بیان پر پروفیسر نذیر احمد صاحب نے ایک طویل محاکمہ کیا ہے، جس کو لفظ بہ لفظ نقل کرنا طوالت کا باعث ہوگا، اس لئے ہم ان کے فرمودات کا ایک خلاصہ اپنی زبان میں تحریر کر رہے ہیں، نذیر احمد صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ گجرات کی حکومت کا زوال اکبر کے عہد میں ۹۸۰ھ میں ہوا تھا، ابراہیم عادل شاہ ۹۸۸ھ میں نو سال کی عمر میں تخت نشین ہوا تھا، اس لئے زور صاحب کے بیان کردہ واقعہ کا تعلق ابراہیم عادل شاہ سے نہیں ہوسکتا، مزید برآں دلاور خاں نے اپنے دور وزارت میں (۹۹۰-۹۹۸ھ) صرف گجرات ہی کے نہیں بلکہ لاہور وغیرہ کے علماء کو بھی بیجاپور میں بسنے کی دعوت دی لیکن بساتین کی عبارت یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ تمام کے تمام علماء وفضلا مذہبی علوم کے عالم تھے ادیب نہ تھے، زور صاحب کے اس دعوے کو بھی نذیر صاحب نے صحیح قرار نہیں دیا ہے کہ گجرات کا ادبی پرچم بیجاپور میں لہرا رہا تھا، انھوں نے اس دعوے کی تردید اس شہرت کی بنا پر کی ہے جس کو زور صاحب نے ابتدا میں درج کیا ہے، پروفیسر نذیر احمد صاحب نے اپنی تحقیق سے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ ان فضلا اور شعراء میں سے کسی ایک کا بھی براہ راست گجرات سے تعلق نہ تھا، اس سلسلے میں انھوں نے تاریخ فرشتہ، تذکرۃ الملوک، مآثر رحیمی وغیرہ سے اپنی بات کی تائید میں عبارتیں پیش کی ہیں، ڈاکٹر زور صاحب کی جو عبارت ہم نے اوپر نقل کی ہے اس میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ گجری زبان گجراتی اور دکھنی زبانوں کا آمیزہ ہے، پروفیسر نذیر احمد صاحب نے ڈاکٹر زور صاحب کی اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے یہ تحریر فرمایا ہے:

''جہاں تک گجری زبان کا تعلق ہے، مجھے اس سے بحث نہیں، البتہ اس کے معرض وجود میں آنے کے ضمن میں یہ عرض کرنا ہے کہ ڈاکٹر زور نے اپنے قیاس کی تائید میں شاہ برہان الدین جانم کی مثال پیش کی ہے جو اپنی زبان کو گجری کہتے تھے، چونکہ شاہ مذکور کی وفات ۹۹۰ھ میں یعنی عہد ابراہیمی کے ابتدائی دوسال کے اندر ہی ہو چکی تھی، اس لئے ان کو اس عہد کے گجراتی لوگوں سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا ہوگا اور یہ بات بھی قابل غور ہے کہ شاہ جانم کا انتقال حکومت گجرات کے بالکل خاتمے سے کچھ پہلے ہی ہوا تھا، غرض شاہ موصوف کی مثال سے جو نتیجہ نکالنے کی کوشش کی گئی ہے وہ بے سود و لا حاصل ہے۔''(۶۱)

صرف اسی ایک مثال سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پروفیسر نذیر احمد صاحب نے کس تحقیق اور دیدہ ریزی کے ساتھ زور صاحب کے فرمودات کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے ان کی فروگزاشتوں کو واضح کیا ہے، اس قسم کے مقالوں کی اشاعت نے معارف کے معیار کو برقرار رکھا اور اسی وجہ سے وہ شاہ صاحب کے دور ادارت میں بھی اردو کے صف اول کا علمی جریدہ بنا رہا۔

۱۹۳۶ء میں جو ترقی پسند ادبی تحریک کی بنیاد پڑی تھی اس سے منسلک ادیبوں اور شاعروں کی تحریریں معارف میں شاید ہی کبھی شائع ہوئی ہوں، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم، سجاد ظہیر اور علی سردار جعفری جیسے اردو کے ادیبوں اور ناقدوں نے نہ تو معارف کو درخور اعتنا سمجھا اور نہ ہی معارف نے ان حضرات کو، اس لئے اردو تنقید کی دنیا میں بالخصوص جو انقلاب آ رہا تھا اس کے نمونوں سے معارف کے صفحات ہم کو یکسر خالی ہی نظر آتے ہیں، ۱۹۵۹ء کے معارف میں اردو کے ایک ایسے جواں مرگ ناقد کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے، جو اردو کی ترقی پسند ادبی تحریک سے بہت متاثر تھا، اس لئے ہم ان صفحات میں اس تحریر کا خاص طور سے ذکر کر رہے ہیں۔

فیض الرحمٰن اعظمی مرحوم ایک ترقی پسند ناقد تھے، جن کا مقالہ ''غبار خاطر پر ایک نظر'' کے عنوان سے جنوری ۱۹۵۹ء کے معارف میں شائع ہوا ہے، اس مقالہ میں فیض الرحمٰن صاحب اپنے ادبی افکار و نظریات سے دست بردار تو نہیں ہوئے، مگر انھوں نے اپنا انداز بیان ایسا رکھا ہے کہ ان کی تحریر معارف کے معروف معیار کو مجروح کئے بغیر اس میں جگہ پا سکے، فیض الرحمٰن صاحب نے ''غبار خاطر'' کو اردو خطوط نگاری کی تاریخ میں بدلے ہوئے رجحان کا حامل قرار دیا ہے اور اس کی

اہمیت اس بات میں مضمر قرار دی ہے کہ

''اس کے خط غبار سے مولانا کی واردات قلب اور نفسیات کا تھوڑا بہت اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اس میں مولانا کی فطرت کی تصویر زندہ اور متحرک نظر آتی ہے اور ان کی کم آمیزی، مشکل پسندی، انانیت اور انفرادیت، غمگینی اور احساس شکست، طنز اور مزاح، مطالعۂ کائنات اور مشاہدۂ فطرت، مذہب اور فلسفے کے دقیق مسائل سب پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑتی ہے، لیکن ادب اور زندگی کی کوئی راہ بھی ہو مولانا تقلید کے بجائے اجتہاد کے قائل ہیں، وہ کسی ایسی عمومیت سے مفاہمت نہیں کر سکتے جو ان کی مخصوص عقلیت کے سانچے میں ڈھل نہ سکے، وہ معمولی سی معمولی باتوں میں بھی اپنے لئے ایک امتیاز پیدا کر لیتے ہیں، سیدھی سادی بات بھی عمومی انداز میں نہیں کہہ سکتے، قید کی پابندیوں میں اپنے ذوق نگارش کا بیان اس انداز سے ختم کرتے ہیں، ''لوگوں نے نامہ بری کا کام کبھی قاصد سے لیا، کبھی بال کبوتر سے، ہمارے حصہ میں عنقا آیا'' اسی طرح سونے جاگنے اور کھانے پینے میں بھی ان کا مسلک تقلید نہیں اجتہاد ہے۔'' (۶۲)

پھر اس کے بعد انھوں نے مولانا آزاد کے اجتہادات سے بحث کرتے ہوئے ان کے بہت سے خطوط کا تجزیہ کر کے ان تمام اجتہادات کو واضح و روشن کیا ہے جو فیض الرحمٰن صاحب مرحوم کے نزدیک مولانا آزاد کی شخصیت کے اصل اور حقیقی عناصر ہیں، اس سلسلے میں انھوں نے مولانا آزاد کے خطوط سے وافر مثالیں دیتے ہوئے ان کے ادبی، علمی اور مذہبی اجتہادات کو نمایاں کرنے کی سعی کی ہے، فیض الرحمٰن صاحب کا یہ بھی خیال ہے کہ انشاء اور مکتوب نگاری کے نقطۂ نظر سے ممکن ہے محدود حیثیتوں میں غبار خاطر کے مکاتیب زیادہ وقعت نہ رکھتے ہوں لیکن ان کے نزدیک یہ خطوط انسانی نفسیات کے مطالعہ کا بہترین وسیلہ ہیں اور ان خطوط کو اسی نقطۂ نظر سے پڑھنا چاہئے۔

علاوہ ازیں فیض الرحمٰن صاحب نے ان خطوط کو ایک طرح سے مولانا آزاد کی سوانح عمری قرار دیا ہے اور اپنے مقالے کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا ہے:

''یہ ایک طرح کی خود نوشت سوانح عمری ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا کی افتاد طبع کو سمجھنے کے لئے ''غبار خاطر'' کا مطالعہ نہایت ضروری ہے، اس میں ہم کو خیالات کی

وہ رفعت ونزاکت اور ادب اور آرٹ کے وہ نمونے ملتے ہیں جو مولانا کو ایک بڑے آرٹسٹ، ایک بلند پایہ ادیب، ایک عظیم مفکر و فلسفی منوانے کے لئے کافی ہیں اور ان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سیاست اور مذہب کے خشک میدانوں کو قلم کی سحر کاری سے کس قدر دلکش و دلفریب بنایا جا سکتا ہے، ان تمام حیثیتوں سے غبار خاطر کا اردو ادب میں اتنا بلند مقام ہے کہ اس بلندی کو سمجھنے کے لئے بھی بڑی دیدہ وری کی ضرورت ہے۔" (۶۳)

اس مقالے کے علاوہ شاید ہی کوئی ترقی پسند ادیب یا ناقد ایسا ہو جس نے معارف کے لئے کچھ لکھا ہو اور معارف نے اس کو شائع کیا ہو، اس لحاظ سے بھی فیض الرحمٰن صاحب کا یہ مقالہ خاصی اہمیت کا حامل ہے، لیکن اس کے بعد معارف اپنی "وسیع القلبی" پر قائم نہ رہا اور اس میں "قدیم دبستان تنقید" کے جواہر پارے ہی شائع ہوتے رہے۔

معارف کے دوسرے دور کے اواخر سے کچھ نوجوان اہل قلم نے بھی اس علمی بزم میں شرکت کرنی شروع کی جن میں ڈاکٹر احتشام احمد ندوی، ڈاکٹر احسن الظفر، ڈاکٹر عبدالباری، ڈاکٹر زیدی جعفر رضا، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر شفیق احمد خاں ندوی اور ڈاکٹر عبدالحق وغیرہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں، مگر یہ حضرات معارف کے مستقل مقالہ نگار نہ بن سکے، ان سب لوگوں نے اپنی الگ الگ راہیں نکالیں اور دوسرے دوسرے جرائد میں شائع ہونے لگے، تاہم کبھی کبھی نوجوان اہل قلم کے نام بھی معارف میں نظر آ جاتے ہیں، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دو نسلوں کے درمیان ابھی ایسا خلا پیدا نہیں ہوا ہے جس کو پر نہ کیا جا سکے۔

بہر حال شاہ صاحب نے ممکن حد تک معارف کے گزشتہ معیار کو باقی رکھنے کی کوشش کی، جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہے، صرف ادبیات کے سلسلے میں معارف اس زمانے کی روش کا ساتھ نہ دے سکا اور نہ ہی اس نے اپنی کوئی نئی راہ نکالی، کہ دوسرے دوسرے لوگ بھی اس کے ہم سفر ہو سکیں، اس لئے معارف کے دوسرے دور میں جرائد کی ادبی سیادت اس کے ہاتھوں سے نکل گئی اور صرف علمی سیادت اس کے ہاتھوں میں رہ گئی، ضرورت اس بات کی ہے کہ معارف نے جو کچھ کھویا ہے اس کو دوبارہ حاصل کرے اور جو کچھ اس کے پاس ہے اس کو فعال اور متحرک رکھے۔

معارف کے تیسرے دور کے مطالعے کا آغاز ہم اس کے شذرات سے کرتے ہیں،

سید صاحب اور شاہ صاحب کی روش کو برقرار رکھتے ہوئے سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب بھی معارف کے شذرات میں ملکی مسائل پر اظہار خیال فرمایا کرتے ،لیکن چونکہ ان کی طبیعت ایجاز پسند نہیں بلکہ اطناب پسند تھی ،اس لئے وہ اپنی تمہید کو اتنا پھیلا دیتے اور اس پر اتنا زور صرف کر دیتے کہ اصل موضوع تک آتے آتے ان کی ساری توانائی قلم صرف ہو چکی ہوتی معلوم ہوتی ہے،مثال کے طور پر اکتوبر ۱۹۸۱ء کے شذرات کو پیش کیا جا سکتا ہے،جس کو صباح الدین صاحب کی اطناب پسندی ہی کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

اس ماہ کے شذرات کا اصل موضوع یہ ہے کہ فرقہ پرست عناصر مسلمانوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے وطن کے خیر خواہ اور وفادار نہیں ہیں، صباح الدین صاحب نے سات صفحات کے شذرات میں اپنی تاریخ خوانی کا تو بڑا اچھا ثبوت پیش کیا ہے اور قارئین کے دلوں پر اس بات کی دھاک بٹھا دی ہے کہ ان کا ہندوستان کی عہد وسطیٰ کی تاریخ کا مطالعہ بہت گہرا ہے اور ان کا علم مستحضر ہے،مگر اس طول طویل تحریر میں اصل جواب کی صرف لرزتی سی پرچھائیاں ہی نظر آتی ہیں،مکمل جواب نہیں ،انھوں نے اپنے شذرات میں سارا زور اس بات پر صرف کیا ہے کہ تاج المآثر کے مصنف حسن نظامی نیشاپوری، جوامع الحکایات اور لباب الالباب کے مصنف سدید الدین عوفی، مشہور صوفی اور شاعر امیر خسرو، اکبر کے ملک الشعراء فیضی، اکبری دربار کا گل سرسبد ابوالفضل مشہور شاعر طالب آملی وغیرہ نے ہندوستان کے موسموں، پھلوں، پھولوں، پرندوں، ہندوستانی حسن، موسیقی اور علم ودانش کی کیا کیا اور کن کن الفاظ میں تعریف کی ہے، ہمارے خیال میں شذرات کی ابتدا میں جس الزام کا ذکر کیا گیا ہے اس کا جواب یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان کی کن کن چیزوں کو کس کس انداز سے دیکھا،اس کا جواب تو یہ ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کی خیر خواہی ووفاداریٔ وطن کے واقعات تاریخی حوالوں کے ساتھ اس طرح جمع کر دئے جائیں کہ معترضین کو خاموشی اختیار کرنی پڑے،غالباً وہ اپنی اطناب پسندی میں اس بات کو فراموش کر گئے کہ ان کو اصل میں کس بات پر زور دینا تھا۔ ہمارے معروضات کی تصدیق صباح الدین صاحب کے درج ذیل بیان سے ہو جائے گی:

"تاج المآثر کا مصنف حسن نظامی نیشاپور کا رہنے والا تھا، وہ سلطان شمس الدین

التمش کے عہد میں دہلی میں آکر سکونت پذیر ہو گیا، یہ شہر اس کو اس قدر پسند آیا کہ اس کو ہندوستان کا ام البلاد کہنے لگا، ایک موسم بہار میں وہ لاہور گیا تو راوی کے کنارے کھڑے ہو کر وہاں کے موسم سے ایسا متاثر ہوا کہ اپنے اشعار میں کہتا ہے کہ اس کی مٹی میں آذر کے سیکڑوں اثرات دکھائی دے رہے ہیں، اس کی ہوا سوسن اور گلاب سے چاندی اور سونے حاصل کر رہی ہے، اس میں مصور مانی کے سیکڑوں نقشے نظر آرہے ہیں، اس میں دم عیسیٰ ہے، اس کی نسیم سحری زندگی میں روح پھونک رہی ہے، اور زمردین جام میں مستانہ بلبل کو صبح کی شراب پیش کر رہی ہے۔'' (۶۴)

اسی طرح کی ایک دوسری مثال جنوری ۱۹۸۴ء کے شذرات سے پیش کی جاسکتی ہے، زیر بحث شذرات کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں قیادت کے فقدان کا اصل سبب کیا ہے؟ صباح الدین صاحب نے معارف کے تین صفحات میں اس موضوع پر اپنے خیالات پیش فرمائے ہیں، ہم جب ان کے فرمودات کا جائزہ لیتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کر پائے، ان کا خیال ہے کہ مسلمان مذہب کے نام پر تو اپنی جان و مال لٹا سکتا ہے، مگر کسی مذہبی عالم کو اپنا سیاسی رہنما نہیں بنا سکتا، اپنے دعوے کی تائید میں انھوں نے سر سید احمد خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمود حسن، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبیداللہ سندھی، مفتی کفایت اللہ وغیرہ کی ان خدمات کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے ملت اسلامیہ کی رہبری کے سلسلے میں انجام دی ہیں، پھر یہ سوال کیا ہے کہ مولانا آزاد وغیرہ کے ہوتے ہوئے محمد علی جناح کیوں اور کیسے مسلمانوں کے مسلمہ لیڈر بن گئے، اس کا جواب صباح الدین صاحب نے محمد علی جناح کی ایک نجی گفتگو کے ذریعے دیا ہے جو ان کے ایک دوست اور قائد اعظم کے درمیان ہوئی تھی، قائد اعظم نے ان صاحب کو بتایا تھا کہ ایک دن گاندھی جی نے ان سے سوال کیا کہ وہ کون سی بات ہے جس سے آپ نے مسلمانوں پر مسمریزم کر دیا ہے، قائد اعظم نے اس کے جواب میں کہا تھا:

''ہاں! میں نے ضرور ان پر مسمریزم کر دیا ہے، آپ جانتے ہیں کہ میں پنج وقتہ نماز کا پابند نہیں ہوں، روزے بھی نہیں رکھتا ہوں، میرے گلے میں تصوف کا کوئی بالشتی نہیں، پھر بھی ان مسلمانوں نے مجھ کو اپنا قائد اعظم تسلیم کر لیا ہے، جانتے ہیں کیوں؟ یہ مسلمان سب

جذبات کی صحیح ترجمانی نہیں کرسکتے، میں ان کے جذبات کی صحیح ترجمانی کررہا ہوں، اس لئے وہ مجھ کو اپنا قائداعظم تسلیم کئے ہوئے ہیں، لیکن جس روز ان کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرنا چھوڑ دوں گا، میں جانتا ہوں کہ یہی قائداعظم تسلیم کرنے والے مسلمان مجھ کو Kick out کردیں گے۔" (٦٥)

قائداعظم کے اس جواب سے صباح الدین صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قیادت کی شان یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے مقتدیوں کے جذبات کی ترجمانی صحیح وقت اور صحیح طریقے سے کرے، اس کے بعد انھوں نے سوال کیا ہے کہ مولانا مودودی اور مولانا نورانی کی موجودگی میں ذوالفقار علی بھٹو اور مجیب الرحمٰن پاکستان کی سیاست پر کیسے چھا گئے، اور مولانا مفتی محمود صوبۂ سرحد کے بہت دنوں تک وزیراعلیٰ کیوں نہ رہ سکے؟ ہندوستان میں جماعت اسلامی اور جمعیۃ العلماء عام مسلمانوں میں کیوں مقبول نہ ہوسکیں؟ ان کے نزدیک ان سوالات پر خود علماء کو سوچنا چاہئے اور یہ دیکھنا چاہئے کہ ان کے طرزِ عمل میں کہاں پر خامی ہے جس کی بنا پر یہ صورت حال سامنے آتی ہے۔

صباح الدین صاحب نے اپنے شذرات کا آغاز ہندوستانی مسلمانوں میں قیادت کے فقدان سے کیا تھا مگر بجائے اس کے کہ وہ اصل اسباب کا جائزہ لیتے اپنے جوشِ بیان میں ہندوستان سے پاکستان پہنچ گئے، جہاں کے مسلمانوں کے مسائل ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے یکسر مختلف ہیں اور ان کی تحریروں سے یہ نتیجہ بھی برآمد ہوتا ہے کہ مولانا محمود حسن، مولانا آزاد، مولانا سندھی، مولانا مدنی، مولانا احمد سعید، مفتی کفایت اللہ اور ایسے ہی برگزیدہ علماء نے اپنے مقتدیوں کے جذبات کی ترجمانی نہ تو صحیح وقت پر اور نہ ہی صحیح طریقے سے کی، ورنہ وہ حضرات بھی مسلمانوں کے مسلمہ لیڈر رہوتے، اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں میں قیادت کا فقدان ہے، مگر اس کا سبب وہ نہیں ہے جو صباح الدین صاحب نے تحریر فرمایا ہے، اس کا اصل سبب ان مخصوص حالات میں مضمر ہے جس سے ہندوستانی مسلمان دوچار ہیں اور جب تک اصل سبب تک رسائی حاصل نہ ہوگی بیماری کا غلط علاج ہی تشخیص کیا جاتا رہے گا۔

سید صاحب اور شاہ صاحب کی تقلید میں صباح الدین صاحب معارف کے شذرات میں معاصر ادیبوں اور شاعروں کی وفات پر بھی کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے، ان حوادث پر کچھ لکھتے وقت

ان کا انداز تحریر کیا ہوتا، مثلاً احسان دانش کی وفات پر لکھتے ہیں۔

''ان کی رحلت سے اردو شعروادب کے قصر کی رنگارنگی میں بڑی کمی پیدا ہوگئی ہے، احسان دانش نے اپنی زندگی ایک پریشان حال مزدور کی حیثیت سے شروع کی لیکن اپنی وفات سے پہلے اردو شاعری کے ایک تاجدار تسلیم کرلئے گئے تھے، ۱۹۴۷ء سے پہلے وہ اعظم گڑھ کے مشاعروں میں برابر آتے رہے، اس وقت تک ان کے کلام کے مجموعوں میں نفیر فطرت، جادۂ نو، چراغاں، درد زندگی، نوائے کارگر، آتش خاموش، حدیث ادب اور گورستان وغیرہ چھپ چکے تھے، مشاعرہ کے اسٹیج پر آتے تو ان کے چہرہ سے ان کی زندگی کی سادگی اور پریشانی ظاہر ہوتی مگر کلام سناتے تو ان کے خیالات کی پرکاری اور رعنائی سے سامعین متاثر ہوکر محسوس کرتے کہ وہ اپنی شاعری میں جادۂ نو پر چل رہے ہیں، غزلیں سناتے تو تغزل کا چراغاں کرکے درد زندگی کے راز پنہاں کو عیاں کرتے، ان کی زندگی زیادہ تر پریشانیوں میں گزری، مگر وہ آتش خاموش بن کر ایک شاعر کا حق ادا کرتے رہے، اس لئے ان کی سخنوری نوائے کارگر اور حدیث ادب بنی رہی، ان کی مشق سخن کی کہانی ان ہی کی زبانی یہ ہے کہ جب ان پر جذبۂ شاعری طاری ہوتا تو وہ اپنی روح میں التہاب پاتے اور جب شعر سپرد قلم کردیتے تو محسوس کرتے کہ الفاظ میں کاغذ پر، دائروں، مرکزوں اور پیوندوں کے نیچے ان کی روح دبتی چلی جارہی ہے اور جب کوئی نظم پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی تو اپنی روح کو سبک اور آرام طلب پاتے، پھر وہ میٹھی نیند سو جاتے۔'' (۶۶)

اس عبارت کو پڑھ کر اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ عمر کے ساتھ ساتھ صباح الدین صاحب کی تحریروں میں تکلف اور تصنع کا عنصر بھی بڑھتا چلا گیا ہے۔ شذرہ کو پڑھ کر احسان دانش کی تو مبہم ہی سی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے مگر صباح الدین صاحب کی پرتکلف نثر ضرور پوری طرح جلوہ گر ہو جاتی ہے۔

ہم نے طوالت سے بچتے ہوئے صرف تین اقتباسات پر اکتفا کیا ہے، ان ہی کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ معارف کے دور اول کے شذرات کی ابتدا کس انداز سے ہوئی تھی اور اب دور سوم میں وہ کہاں پہنچ چکا ہے، نہ تو ان شذرات میں پہلے والا استدلال ہے نہ

ایجاز، نہ مسائل فہمی اور نہ ہی دقت نظری، صرف ایک روایت ہے جو بہر حال باقی ہے۔

آثار علمیہ وادبیہ کے عنوان سے معارف کے پہلے اور دوسرے دور میں جو خطوط شائع ہوتے تھے، وہ واقعتاً اور حقیقتاً علمی وادبی آثار کہے جانے کے مستحق ہوتے، افسوس ہے کہ اس کے تیسرے دور میں اس عنوان سے جو مکاتیب شائع کئے جاتے وہ صحیح معنوں میں نہ تو علمی ہوتے اور نہ ہی ادبی، بلکہ وہ ایسے نجی خطوط ہوتے جن کا منظر عام پر آنا اور نہ آنا دونوں برابر، مثال کے طور پر مئی ۱۹۷۸ء میں سید صاحب مرحوم کا درج ذیل خط شائع کیا گیا ہے، جس کی علمی اور ادبی حیثیت کسی تبصرہ سے بے نیاز ہے، یہ خط سید صاحب نے شیخ نذیر حسین صاحب (مدیر اردو انسائیکلو پیڈیا لاہور) کو لکھا تھا:

"مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حج کی مبارک باد کا شکریہ، آپ کے حالات سن کر خوشی ہوئی، سلیس عبارت کی حسب ذیل کتب سوانح وتاریخ کا مطالعہ فرمائیں، سیرت ابن ہشام، مقدمہ تاریخ ابن خلدون، کتاب البیان والتبیین للجاحظ، عام مطالعہ کے لئے تاریخ ابن خلدون، تاریخ ابوالفداء حدیث مین مشکوۃ شروع کیجئے۔

المثل السائر، کتب معانی وادب میں سے ہے، اس میں قرآن پاک کی آیات کی فصاحت وبلاغت کے تذکرے جابجا آتے ہیں، کتاب کا نام المثل السائر ہے، اسی نام سے عربی کتب فروشوں کی دوکانوں پر ملے گی۔الحمدللہ اب مع الخیر ہوں۔ والسلام

سید سلیمان ندوی

۲۸/جنوری ۱۹۵۰ء" (۶۷)

اسی شمارہ میں سید صاحب کا جو دوسرا خط شائع ہوا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں، وہ تحریر فرماتے ہیں:

"مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خط ملا، مقدمہ ابن خلدون بار بار دیکھیں اور سمجھ کر دیکھیں، سوانح مشاہیر اسلام کے لئے

تاریخ ابن خلکان دیکھیں، نہایت عمدہ کتاب ہے اور زبان وادب کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے، ابن اثیر واقعات کی کھتونی ہے، اس میں زبان کی حلاوت اور ادب کا نمک نہیں، عربی اشعار کے ایسے مجموعے جن میں ہر دور کا کلام ہو، آج کل متعدد لکھے گئے ہیں، اور کتب فروشوں کے پاس ملتے ہیں، مگر جو بات ابوتمام کے حماسہ کی ہے وہ کسی میں نہیں، گو یہ صرف جاہلین اور اسلامیین کے کلاموں کا مجموعہ ہے۔

حجاز کے موجودہ سفر کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا، اس لئے کوئی تحریر بھی شائع نہ ہو سکی۔

والسلام

سید سلیمان ندوی (۱۱/اپریل ۱۹۵۰ء)" (۶۸)

مذکورہ بالا دونوں خطوط کو امر اتفاقی کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جولائی ۱۹۸۱ء کے معارف میں بھی اسی طرح کے نمونے نظر آتے ہیں، اس شمارہ میں شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کے ایسے خطوط شائع کئے گئے ہیں جن میں کوئی علمی وادبی پہلو نہیں ملتا، ہماری بات کی تصدیق درج ذیل دو خطوط سے ہو جائے گی۔

"اعظم گڑھ، ۱۹/مئی ۱۹۷۱ء

مکرمی : السلام علیکم

رسالے بھی مل گئے تھے، اور خط بھی ملا، اس سے پہلے خط کا جواب میں نے رائے بریلی دیا تھا، معلوم ہوتا ہے وہ نہیں ملا، موجودہ حالات کے متعلق آپ نے جو کچھ فرمایا ہے، صحیح ہے لیکن اب حالت ایسی بگڑ گئی ہے کہ جب تک کوئی بڑا مصلح اور مجدد نہ پیدا ہو محض تقریر وتحریر اور وعظ وپند سے اصلاح کی امید نہیں تاہم جو کچھ امکان میں ہے اس کو تو کرنا ہی چاہئے، یہ فرض تو کسی حال میں ساقط نہیں ہوتا، رسالوں پر معارف میں ریویو ہوگا اور امید ہے سب خیریت ہوگی۔ معین الدین" (۶۹)

اعظم گڑھ۔

مکرمی! السلام علیکم

ادھر عرصہ سے آپ کا خط نہیں آیا تھا، میں خط لکھنے والا تھا کہ آپ کا خط آ گیا، جس مضمون کو آپ نے پسند فرمایا ہے، اس کی دوسری قسط جولائی کے پرچہ میں چھپ رہی ہے، ابھی وقتاً فوقتاً اس کا سلسلہ قائم رہے گا، آپ کے باقی رسالوں پر ریویو کے لئے ہدایت کر دی ہے، ہفتہ عشرہ میں ردولی جانے کا ارادہ ہے، آخر جولائی تک واپسی ہوگی۔

معین الدین۔ ۲؍جولائی ۱۹۷۴ء"(۷۰)

انھیں چند نمونوں سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سید صاحب اور شاہ صاحب کے زمانہ میں آثار علمیہ اور آثار علمیہ وادبیہ کے عنوان کے تحت جو پُرمغز تحریریں شائع ہوتی تھیں، معارف کے تیسرے دور میں ان میں کیسا زبردست انحطاط پیدا ہو گیا، ان عنوانات کے تحت جو تحریریں شائع کی گئیں وہ نکتہ آفرینی سے عاری معلوم ہوتی ہیں۔

آثار علمیہ وادبیہ کے زوال کی نشاندہی گذشتہ سطور میں کی جا چکی ہے، اب ہم معارف کے ایک دوسرے اہم عنوان "باب التقریظ والانتقاد" پر ایک نظر ڈالتے ہیں، معارف کے اس تیسرے دور میں اس عنوان سے بہت ہی کم لکھا گیا اور جو کچھ لکھا بھی گیا اس میں تقریظ ہو تو ہو انتقاد کا عکس بھی دکھائی نہیں دیتا، مثال کے طور پر علامہ سر محمد اقبال کے صاحبزادے جسٹس جاوید اقبال نے اپنے والد محترم کی ایک سوانح عمری "زندہ رود" کے نام سے لکھی جو تین جلدوں میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے "زندہ رود" کی تینوں جلدوں پر اس عنوان کے تحت لمبی لمبی تحریریں لکھیں ہم طوالت کے خوف سے ان سطور میں صرف جلد اول کے بارے میں صباح الدین صاحب کی تحریر کا ایک جائزہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

اس عنوان کے تحت جو کچھ تحریر فرمایا گیا ہے اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے نثر میں شاعری کی ہے، ہمارے نزدیک درج ذیل اقتباس ان کی اس تحریر کا مطلع ہے:

"مذکورۂ بالا کتاب کے گرد پوش پر ایک رنگین تصویر میں علامہ محمد اقبال ایک بچہ کو گود میں لئے ہوئے انتہائی مسرور نظر آ رہے ہیں، یہ وہ بچہ ہے جس کے نام پر انھوں نے اپنی ایک مشہور مثنوی کا نام رکھا اور آگے چل کر اس کو مخاطب کر کے کہا۔

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

اور یہ بھی:

جس گھر کا مگر چراغ ہے تو
ہے اس کا مذاق عارفانہ

یہ بچہ -- ڈاکٹر جاوید اقبال.........اب جوان ہو کر لاہور ہائی کورٹ کا جج ہے، اپنے والد بزرگوار کے کلام کا صحیح ترجمان بھی بن گیا ہے، اور چند مہینے پیشتر اردو زبان وادب کے افق پر ان کے سوانح نگار کی حیثیت سے نمودار ہوا ہے۔'' (۷۱)

صباح الدین صاحب چونکہ سید صاحب کے علاوہ شاہ صاحب کے بھی جانشین تھے اس لئے وہ اپنی تحریروں میں علم الکلام، فلسفہ اور منطق کے مسائل بھی زیر بحث لے آتے ہیں، مثلاً ان کا یہ ''فلسفیانہ جملہ'' ملاحظہ ہو، اس میں (زندہ رود میں) وہ بھی ہے جوان کو معلوم نہ تھا اور وہ سب کچھ ہے جوان کو معلوم تھا یہی ''فلسفیانہ انداز بیان'' ان کی پوری تقریظ وتنقید میں نمایاں ہے۔

اقبال نے بعض قرائن سے یہ اندازہ لگایا ہے کہ ان کے اجداد میں ایک بزرگ ''لول حج'' نامی تھے، جن کی آنکھیں بھینگی اور ٹانگیں ٹیڑھی تھیں، جب ان کی شادی ہوئی تو ان کی بیوی ان پر ہنسا کرتیں، اس سے دل برداشتہ ہو کر وہ تارک الدنیا ہو گئے اور اس کے فوراً بعد حرمین شریفین کا سفر کیا اور بارہ سال تک سیاحت کرنے کے بعد کشمیر واپس آئے، علامہ اقبال کے بعض سوانح نگاروں نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ میاں بیوی کی ناچاقی پہلی رات ہی میں ہوگئی تھی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ڈاکٹر جاوید اقبال کی ہر بات کو درست تسلیم کرتے جاتے ہیں اور ان کے ذہن میں یہ سوال نہیں اٹھتا کہ بابا لول حج کی نسل کیسے چلی؟ کیا واقعی اقبال ان کی نسل سے ہیں یا بابا لول حج سے ان کے خاندان کا جو سلسلہ جوڑا گیا ہے وہ مزید تحقیق کا طالب ہے۔

اس کے بعد صباح الدین صاحب نے صرف یہ بتانے پر اکتفا کیا ہے کہ جاوید اقبال صاحب نے کس باب میں کیا لکھا ہے، انھوں نے جو کچھ بھی تحریر کیا ہے اس کی ہر ہر سطر پر صباح الدین صاحب آمنا صدقنا کہتے چلے جاتے ہیں اور کہیں بھی ٹھہر کر یہ غور نہیں کرتے کہ جاوید اقبال

صاحب نے جو کچھ تحریر کیا ہے اس میں کہیں کوئی جھول تو نہیں ہے، ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

''اقبال کے گھر کا ماحول دیندارانہ اور درویشانہ تھا، جس میں محبت وشفقت کے ساتھ عزت واحترام کو بڑا دخل تھا، اقبال گو لطائف وجدانی کو تسلیم کرتے تھے، ان کے ورود کا ذاتی تجربہ بھی کچھ حد تک رکھتے تھے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ بعد کی زندگی میں تصوف کے بارے میں علمی اعتبار سے ان کے ذہن میں کچھ الجھنیں پیدا ہوئیں اور ان کا زاویہ نگاہ بدل گیا۔''(۷۲)

اس پر صباح الدین صاحب حاشیہ چڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ رائے بڑی اہم ہے، علامہ اقبال اور تصوف کا مسئلہ بڑا متنازعہ فیہ ہو کر رہ گیا ہے، اس لئے یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان الجھنوں کی ابتلاء سے تصوف سے متعلق ان کا زاویہ نگاہ عارضی یا مستقل طور پر بدلا رہا اور ان کی یہ الجھنیں عجمی تصوف یا اسلامی تصوف سے پیدا ہوئیں۔''(۷۳)

ایک ناقد کی حیثیت سے صباح الدین صاحب کو درج بالا جملے لکھ کر ہی بات کو ختم نہیں کرنا چاہئے تھا بلکہ اس بات کو تلاش کرنا چاہئے تھا کہ اقبال کو تصوف سے جو بدظنی ہوئی وہ کیوں ہوئی اور وہ کس نوع کے تصوف سے بدظن تھے، علاوہ بریں ان کو اس بات کی نشاندہی تو کر ہی دینی چاہئے تھی کہ عجمی تصوف سے ان کی مراد کون سا تصوف ہے؟ کیوں کہ لفظ عجمی کا اطلاق تو ہر غیر عرب طریق تصوف پر ہوتا ہے، کیا صباح الدین صاحب کے نزدیک اقبال ''عربی تصوف'' جس کو وہ اسلامی تصوف کہتے ہیں کے قائل تھے، اگر تھے تو چند ہی جملوں میں ان کو اس کی وضاحت کر دینی چاہئے تھی، انھوں نے ایک سوال تو ضرور اٹھایا مگر افسوس ہے کہ اس کا جواب فراہم نہیں کر سکے۔

صباح الدین صاحب اپنی تقریظ وتنقید کے خاتمے پر تحریر فرماتے ہیں:

''اس تقریظ کو پڑھتے وقت بعض قارئین کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اس میں صرف مدح وستائش ہی کے ہار گوندھے گئے ہیں، تنقیص کی کہیں چنگاریاں نہیں ہیں مگر یہ راقم اس کو کیا کرے کہ اس کو علامہ اقبال سے عشق ہے، جب ان کی کہانی ان کے لائق فرزند کی زبانی

بیان ہوئی تو اس میں اس راقم کو وہی لذت ملی جو کسی رند بلانوش کو شیشہ وساغر کی محفل میں مئے دوآتشہ اور سہ آتشہ کے دور میں ملتی ہے۔

جو عشق جاں گداز ہو تو عشق باز کیا کریں۔" (۷۴)

اس مقام پر ہم یاد دلانا چاہیں گے کہ انتقاد "تنقیص کی چنگاریاں برسانے" کا نام نہیں ہے، بلکہ کسی نثر یا نظم پارہ کی باز آفرینی اور اس کے حسن وجمال سے متاثر ہونے کے علاوہ لوگوں کو متاثر کرنے کا نام ہے، ان کو اقبال سے عشق سہی لیکن ان کا عشق اقبال والا عشق ہونا چاہئے، انھیں چند ٹکڑوں کے مطالعے سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ معارف کے تیسرے دور میں باب التقریظ والانتقاد "باب التحسین" بن کر رہ گیا ہے جو معارف کی گزشتہ روایت کے بالکل برخلاف ہے۔

صرف صباح الدین صاحب کی تحریر ہی نہیں بلکہ اس عنوان سے شائع ہونے والی دوسری تحریروں کا بھی یہی حال ہے، مثال کے طور نقوش کے ادبی معرکہ نمبر پر جو تحریر شائع ہوئی ہے وہ بھی پیش کی جاسکتی ہے۔

ساڑھے چار صفحات کی اس تحریر میں تقریباً دو صفحات میں تو صرف مقالوں کی فہرست گنوادی گئی ہے بقیہ ڈھائی صفحات میں ادھر ادھر کی کچھ باتیں کر کے انتقاد اور تقریظ نگاری دونوں کے فریضے انجام دیے گئے ہیں، مثال کے طور پر یہ ٹکڑا ملاحظہ ہو:

> "اس جلد کے دوسرے حصے میں مولوی عبدالباری آسی کے تذکرہ "معرکۂ سخن" سے چند ادبی معرکے پیش کیے گئے ہیں، یہ تذکرہ نیاز فتح پوری کا مرتب کیا ہوا ہے، اس میں جن شعراء کے اشعار پر بعض اہل نظر نے اعتراضات کیے تھے ان کی تفصیل دی گی ہے، مثلاً آتش کے بعض اشعار پر خود اپنے اعتراضات نقل کیے ہیں، اسی طرح میر درد پر آزاد اور اصغر پر آثر کے اعتراضات تحریر کیے ہیں۔ آسی نے جابجا خود بھی اظہار خیال کیا ہے اور بتایا ہے کہ اعتراضات درست ہیں یا نہیں، آسی کے تذکرہ کا محاکمہ علامہ اطہر ہاپوڑوی نے کیا ہے اس نمبر میں وہ بھی شامل کیا گیا ہے، یہ دونوں چیزیں شعر وادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے نعمت غیر مترقبہ ہیں، اس جلد کی ایک خاص چیز معرکہ آرائی پر امام بخش صہبائی کی ایک کتاب "قول فیصل" اور "قول فیصل اس کا پس منظر" (از ڈاکٹر سید محمد اکرم

اکرام) بھی ہے، دوسری جلد کے شروع میں "شاعرانہ اور معاصرانہ چشمکیں" کے زیر عنوان مبسوط اور دلچسپ مقالہ بھی درج ذیل ہے، یہ بات کھٹکتی ہے کہ بعض مباحث کے سلسلہ میں مرتب کا رجحان کھل کر سامنے آگیا ہے، مثلاً "پنجاب میں اردو" کے سلسلہ میں وہ حافظ شیرانی کے ہمنوا اور اردو ہندی اور ہندوستانی کے مسئلہ میں گاندھی جی کے مخالف نظر آتے ہیں، نزاع کا لفظ مؤنث ہے، مرتب نے اسے کئی جگہ مذکر لکھا ہے۔" (۷۵)

درج بالا نمونوں کے مطالعے سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ معارف کے تیسرے دور میں اگرچہ باب التقریظ والانتقاد کا عنوان باقی رہا، مگر اس کی گذشتہ مجتہدانہ شان ختم ہوکر رہ گئی۔

معارف کے تیسرے دور میں ایک حیرت انگیز کمی اور بھی واقع ہوئی، یعنی اب اس میں اردو ادب سے متعلق مقالات خال خال ہی شائع ہوتے، اردو کے سارے صف اول کے لکھنے والے ہندوستان و پاکستان کے دوسرے دوسرے علمی و ادبی رسائل میں اپنے مقالات شائع کروانا پسند کرتے، اس زمانے کے بہت سے اردو کے مستند نقاد ایسے ہیں جن کی ایک سطر بھی معارف میں کبھی شائع نہیں ہوئی، ہم کوئی برسوں کی فائلوں کی ورق گردانی کے بعد کم ہی ایسے مقالات ملے جن کا موضوع اردو ادبیات ہے، ان میں سے ایک مقالہ "معرکہ مکین وسودا" کے عنوان سے فروری ۱۹۸۳ء کے معارف میں شائع ہوا ہے، اس کے مقالہ نگار ڈاکٹر حامد آفاق قریشی صاحب ہیں، جن کے نام سے علمی و ادبی حلقہ عام طور سے نا آشنا ہے، درج ذیل سطور میں ہم اس مقالہ پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں۔

مرزا فاخر مکین، سودا کے ایک معاصر شاعر تھے، آصف الدولہ کے عہد سلطنت میں جب سودا لکھنؤ میں مقیم تھے تو ایک تذکرہ کی اصلاح کے سلسلے میں مکین اور سودا میں اتنا سخت اختلاف ہوا کہ مکین نے اپنے شاگردوں کو حکم دیا کہ وہ سودا کے گھر پر چڑھائی کرکے ان کو بزور ان کے گھر لے آئیں، مکین کے شاگردوں نے ایسا ہی کیا، جب وہ لوگ سودا کو بزور مکین کے گھر لے جارہے تھے تو ان کو راہ میں نواب سعادت علی خاں کی سواری ملی، سعادت علی خان نے جب اس طرح سودا کو جاتے ہوئے دیکھا تو دریافت حال کیا جب ان کو معلوم ہوا کہ سودا کو بزور طاقت لے جایا جارہا ہے تو انھوں نے مداخلت کرکے سودا کو ان لوگوں کے پنجے سے نجات دلائی، اس واقعہ کی خبر جب آصف

الدولہ کو ہوئی تو انھوں نے اپنے وزیر مختار الدولہ کو حکم دیا کہ مکین کو جلاوطن کردیا جائے اوران کے شاگردوں یعنی شیخان لکھنؤ کے محلوں کو کھدوا کر پھنکوا دیا جائے، مختار الدولہ نے مکین کے شاگردوں کو سودا کے گھر پر معافی تلافی کے لئے بھیجا، سودا نے خوش دلی سے ان لوگوں کو معاف کردیا، اس طرح مکین جلاوطن ہونے سے اور شیخان لکھنؤ کے محلے اجڑنے سے بچ گئے۔

اس واقعہ کے سلسلے میں مختلف تاریخ نگاروں نے مختلف اطلاعات فراہم کی ہیں، ڈاکٹر حامد آفاق قریشی صاحب نے ''عبرت الغافلین'' کی مدد سے اس واقعہ کی تمام تفصیلات پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان سے جہاں تک ہوسکا ہے اس واقعہ کی تمام جزئیات فراہم کردی ہیں، اس لحاظ سے یہ مقالہ اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں ایک تاریخی واقعہ کو پوری تاریخی ترتیب سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مگر اس موقع پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا معاصر اردو ادب میں کوئی ایک بھی ایسی قابل غور وفکر کتاب نہیں ہے جس پر معارف کوئی مقالہ شائع کرسکے، افسانہ، ناول، ڈرامہ، رپورتاژ یہ تمام اصناف تو معارف کے لئے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن معاصر اردو نظم ونثر پر تو مقالات شائع کئے جاسکتے ہیں، یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ فارسی اور عربی ادبیات کے بارے میں تو آج بھی معارف میں قابل قدر مقالات شائع ہوتے ہیں، اسی طرح اسلامی علوم وفنون پر بھی قارئین کو اچھے مقالے پڑھنے کو مل جاتے ہیں، مگر معارف جس زبان میں شائع ہوتا ہے اسی کے معاصر ادب سے اس کا اغماض ہماری فہم سے بالاتر ہے۔

دسمبر ۱۹۸۴ء کے معارف میں ہم کو ایک ایسا مقالہ ملتا ہے جس کے لکھنے والے ایک معروف ناقد ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب ہیں، جنھوں نے علامہ سید سلیمان ندوی کی تنقید نگاری پر قلم اٹھایا ہے، اس مقالہ میں انھوں نے سب سے کام کی بات یہ تحریر فرمائی ہے:

> ''تنقید یا ادب کو مشرقی ومغربی دو حصوں میں تقسیم کرنا نامناسب ہے، ادب وتنقید کا کارنامہ ومطالعہ خواہ مغرب میں یا مشرق میں دونوں کی اہمیت ہے اوران کی قدر شناسی کے لئے بلا امتیاز وتعصب ایک اصولی وآفاقی معیار سے کام لینا چاہئے۔'' (۷۶)

ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب جب اس نقطۂ نظر سے مولانا سید سلیمان ندوی کی تنقید نگاری پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کو سید صاحب کا کارنامہ کسی بھی اردو تنقید نگار سے کم نظر نہیں آتا، اس سلسلہ میں

انھوں نے سید صاحب کی تصنیف ''خیام'' اور ''نقوش سلیمانی'' کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا ہے انھوں نے اپنے مقالے میں سید صاحب کے اس مقدمہ کا خاص طور سے ذکر کیا ہے جو انھوں نے شاد عظیم آبادی کے ایک مجموعۂ کلام پر لکھا تھا اور جس کو وہ سید صاحب کا زبردست ادبی کارنامہ قرار دیتے ہیں، مقالہ نگار کے نزدیک اس مقدمے کی روح حسب ذیل پیراگراف میں جلوہ گر ہے:

> ''شاد کا خاندان دلی سے عظیم آباد آیا تھا، لیکن ان کی صحبت اور ان کا تعلق زیادہ تر لکھنؤ کے ارباب کمال سے رہا، تاہم یہ امر تعجب انگیز ہے کہ ان کی شاعری پر لکھنؤ سے بہت زیادہ دلی کا رنگ نمایاں ہے، ان کے کلام میں کہیں کہیں لکھنؤ والوں کے صنائع بدائع کا نمونہ بھی مل جاتا ہے مگر شاعری کا مذاق، مضامین، معانی، خیالات، سنجیدگی، متانت ہر چیز دلی کا پتہ دیتی ہے، اس کے ساتھ جو چیز شعرائے لکھنؤ کی ان میں نظر آتی ہے وہ الفاظ کی صحت، محاوروں کا تتبع اور فارسی ترکیبوں کا اعتدال کے ساتھ استعمال ہے، اس طرح ہم عظیم آباد کے حضرت شاد کو لفظی حیثیت سے لکھنؤ کا اور معنوی حیثیت سے دلی کا کہیں گے۔''(۷۷)

درج بالا اقتباس میں سید صاحب نے جو کچھ بھی تحریر فرمایا ہے اس میں نہ تو کوئی ایسی ندرت ہے اور نہ ہی کوئی ایسی جدت جس کی بنیاد پر ان کے اس مقالے کو زبردست ادبی کارنامہ کہا جا سکے، اگر بفرض محال ہم اس کو زبردست ادبی کارنامہ مان بھی لیں تو مشکل یہ درپیش ہوتی ہے کہ ہر ادبی کارنامہ، تنقیدی کارنامہ نہیں ہوتا اگر سید صاحب کی درج بالا تحریر پڑھ کر چند افراد کے ہی دل میں یہ داعیہ پیدا ہو جائے کہ وہ شاد کے کلام کا سید صاحب کے فرمودات کی روشنی میں ایک بار پھر سے مطالعہ کر کے ان کی معنویت کی بازیافت کریں تو ہم کو بھی سید صاحب کی تحریر کو ایک زبردست ادبی کارنامہ ماننے میں کوئی تامل نہ ہوگا، لیکن ہمارے ناقص خیال میں عبدالمغنی صاحب نے سید صاحب کا جو پیراگراف نقل کیا ہے وہ زبردست تو دور کی چیز، سرے سے تنقیدی کارنامہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ ان کا ایک تاثر ہے جس کو انھوں نے شستہ و رفتہ زبان میں تحریر کر دیا ہے۔

عبدالمغنی صاحب کے نزدیک سید صاحب کی تنقیدی بصیرت کا دوسرا اہم معرکہ ''شعلۂ طور کا تعارف ہے، جس کو وہ جگر کے پہلے مجموعۂ کلام پر مبصرانہ تنقید قرار دیتے ہیں، تحقیقی اعتبار سے دونوں بیان محل نظر ہے، جگر کا پہلا مجموعۂ کلام ''داغ جگر'' مرزا احسان بیگ مرحوم نے مرتب کر کے

اپنے مقدمہ کے ساتھ اعظم گڑھ سے شائع کیا تھا۔(۷۸)اس لئے ''شعلۂ طور'' کو جگر کا پہلا مجموعۂ کلام اور سید صاحب کے تعارف کو پہلی مبصرانہ تنقید قرار دینا درست نہیں ہے،عبدالمغنی صاحب کے نزدیک سید صاحب نے درج ذیل سطور میں جگر مرحوم کے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے، وہ جگر کی ''حقیقی توصیف'' ہے۔

''جگر کی شاعری کے معنوی خیالات بہت مختصر ہیں، وہ انھیں الٹ پلٹ کر دہراتے رہتے ہیں، مگر جب وہ کہتے ہیں تو سننے والوں کو وہ بات نئی معلوم ہوتی ہے، ہر فطری شاعر کا رنگ مذاق یہی ہوتا ہے کیوں کہ وہ وہی کہتا ہے جو محسوس کرتا ہے، وہ نہیں کہتا جو دوسرے محسوس کرتے ہیں، اور جس طرح ہر شخص کا فطری رنگ طبیعت خاص ہوتا ہے کہ وہی اس سے تراوش کرتا ہے، اس طرح شاعر کا فطری رنگ بھی ایک ہوگا جو ہر جگہ یکساں ہی ظاہر ہوگا۔''(۷۹)

درج بالا تحریر میں سید صاحب نے جگر کی شاعری پر جو کچھ اظہار خیال کیا ہے کیا اس کا اطلاق ان کے ہم عصر فانؔی بدایونی کی شاعری پر نہیں ہوتا؟ کیا اصغؔر کا شمار اسی ذیل کے شعراء میں نہ کیا جائے گا؟ کچھ بعد کے شعراء میں فراقؔ کی شاعری کے بارے میں یہ الفاظ نہیں دہرائے جاسکتے؟ سید صاحب نے درج بالا سطور میں ایک ایسا عمومی بیان دیا ہے جس کا انطباق اردو کے اکثر و بیشتر شعراء پر کیا جاسکتا ہے، اسی سلسلۂ سخن میں سید صاحب نے آگے چل کر حافظ کی شاعری کا بھی یہی وصف قرار دیا ہے، درج بالا تحریر عبدالمغنی صاحب کے نزدیک تنقید ہوتو ہو ہمارے نزدیک اس کی حیثیت ایک عمومی بیان سے زیادہ نہیں ہے۔

سید صاحب نے جگر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا:

''وہ (جگر) مست ہے اور اسی مستی میں کسی نادیدہ کا سراپا مشتاق نظر آتا ہے، وہ اس کے حجابات کو اپنے رعشہ دار ہاتھوں سے بار بار اٹھا دینا چاہتا ہے مگر نہیں اٹھا سکتا، وہ جھانک کر دیکھنا چاہتا ہے مگر نہیں دیکھ سکتا، اس کی تمنا کی آنکھیں اس کو کبھی بے حجاب دکھا دیتی ہیں تو وہ ہاتھ بڑھا کر چھونا چاہتا ہے مگر وہ تصویر نگاہوں سے غائب ہو جاتی ہے۔''(۸۰)

اس تحریر پر تبصرہ کرتے ہوئے عبدالمغنی صاحب نے یہ خیال فرمایا ہے:

''یہ اردو میں تاثراتی تنقید کا ایک بہترین نمونہ ہے، اس میں علامہ کی تنقیدی نگاہ شاعر کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے، اور اس کی تغزل کی تہوں میں غوطہ لگا کر گوہر آبدار نکال لاتی ہے، پھر اس گوہر کی آب وتاب کو ویسے ہی درخشاں الفاظ میں بیان کرنے کے لئے ناقد کا قلم گویا شاعر کا قلم بن جاتا ہے، یہ درحقیقت روح شاعری میں حلول کر کے اس کے عمیق ترین مضمرات کی تشریح کا کمال ہے۔''(۸۱)

ہم نے سید صاحب کی تحریر کو متعدد بار پڑھ کر ''گوہر آبدار'' کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن افسوس ہے کہ ہم کو کوئی ٹوٹا پھوٹا موتی بھی نہ مل سکا، اس طرح کے بیانات تو فارسی اور اردو کے دوسرے شاعروں کے بارے میں بھی دیے جاسکتے ہیں، اس میں جگر کی کیا تخصیص ہے۔

نقوش سلیمانی کا مطالعہ کرنے کے بعد فاضل مقالہ نگار نے اپنے نقطۂ نظر سے ''خیام'' کا بھی مطالعہ کیا ہے لیکن چونکہ خیام ایک فارسی شاعر کے کلام، سوانح اور آثار سے بحث کرتی ہے اس لئے ہم اس سے صرف نظر کرتے ہیں، عبدالمغنی صاحب نے اپنے مقالہ میں سید صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک جگہ تحریر فرمایا ہے:

''یہ شبلی کے دبستان تنقید کا ایک امتیازی جوہر ہے، جس کو عصر حاضر میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ساتھ ساتھ اور کہنا چاہئے کہ ان کے زیر سرکردگی عبدالسلام ندوی، نجیب اشرف ندوی، ابوالحسن علی ندوی، شاہ معین الدین احمد ندوی اور ب سید صباح الدین عبدالرحمن نمایاں کرتے رہے ہیں۔''(۸۲)

اس بیان میں دو باتیں محل نظر ہیں، اول تو یہ کہ نجیب اشرف ندوی مرحوم کا شمار ناقدوں میں کسی بھی طرح نہیں کیا جاسکتا، دوئم یہ کہ مولانا عبدالسلام ندوی کی ادبی خدمات سید صاحب کی سرکردگی میں انجام پذیر نہیں ہوئی ہیں، ادب ہو یا مذہب، معاشرت ہو یا سیاست شبلی کے ان دونوں شاگردوں میں فکر ونظر کا اتنا بڑا فرق واختلاف تھا کہ یہ ایک دوسرے کی سرکردگی میں چل ہی نہ سکتے تھے، ان دونوں کی راہیں جدا جدا تھیں لیکن یہ دونوں کی شرافت ذاتی تھی جس کی بنا پر دونوں میں کوئی ایسا عملی اختلاف نہ ہوا کہ زندگی اجیرن بن کر رہ جاتی۔

گو ہم کو اس مقالے کے بعض مندرجات سے اتفاق نہیں ہے، تاہم عبدالمغنی صاحب کی

محنت کی داد نہ دینا بے انصافی ہوگی، بہرحال ان مقالوں کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ معارف کے تیسرے دور میں اردو ادب سے متعلق جو تحریریں شائع ہوئی ہیں ان کی قدر و قیمت کیا ہے؟

ضرورت اس بات کی ہے کہ معارف اپنی پالیسی میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے اس اجتہادی روش کو اختیار کرے، جس کو اختیار کرتے ہوئے سید صاحب نے اس کا پہلا شمارہ مرتب کیا تھا، مذہبی علوم ہوں یا عقلی، ادبی علوم ہوں یا سماجی، معارف کو ان کا مطالعہ کرتے وقت اپنی اجتہادی روش کو برقرار رکھنا چاہئے، تاکہ ادبی جرائد میں اس کی سیادت قائم رہے، اگر ایسا نہ کیا گیا تو معارف کا نام اردو ادب کی تاریخ کا ایک جزو تو بن جائے گا مگر وہ نئی نسل کو کچھ دینے سے قاصر رہے گا، اس لئے معارف کو اپنے دروازے نو واردوں پر بھی کھول دینے چاہئیں تاکہ اس کے درودیوار سے نئے نئے نغمے گونجتے رہیں۔

☆☆☆

حواشی:

(۱) شاہ معین الدین احمد ندوی، حیات سلیمان، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۷۳ء ص ۹۶۔

(۲) مولانا شبلی متکلم ندوی ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بمھور کے رہنے والے تھے، یہ بھی علامہ شبلی کے عزیز شاگردوں میں تھے، مولانا نے خاصی طویل عمر پائی، جس کا بہت بڑا حصہ انھوں نے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی خدمت میں گزارا، ان کے نام میں متکلم کا اضافہ اس لئے کیا گیا تھا کہ جیراج پور اعظم گڑھ کے ایک عالم اور ندوۃ العلماء کے استاذ مولوی شبلی صاحب سے ان کو ممتاز کیا جا سکے، وہ مولوی شبلی فقیہ کہلاتے تھے۔

(۳) معارف، اعظم گڑھ جولائی ۱۹۱۶ء ص ۵۔

(۴) معارف اپریل ۱۹۲۰ء، ص ۲۴۷۔

(۵) معارف اپریل ۱۹۲۸ء، ص ۲۴۵۔

(۶) معارف، جنوری ۱۹۳۰ء، ص ۶، ۷۔

(۷) معارف، جنوری ۱۹۴۶ء، ص ۲۔

(۸) معارف، اپریل ۱۹۲۰ء، ص ۳۱۴، ۳۱۵۔

(۹) معارف، جون ۱۹۲۰ء، ص ۴۶۵۔

(۱۰) معارف، فروری ۱۹۳۸ء، ص ۱۴۳۔

(۱۱) معارف، جون ۱۹۲۸ء ص ۴۷۳۔

(۱۲) معارف، فروری ۱۹۳۰ء ص ۱۴۲، ۱۴۳۔

(۱۳) معارف، اپریل ۱۹۳۰ء، ص ۳۰۶۔

(۱۴) معارف، فروری ۱۹۳۰ء ص ۱۴۸، ۱۴۹۔

(۱۵) معارف، اپریل ۱۹۳۰ء، ص ۳۰۴۔

(۱۶) معارف، مئی ۱۹۲۰ء، ص ۳۹۱، ۳۹۲۔

(۱۷) معارف، جنوری ۱۹۲۸ء ص ۴۳۔

(۱۸) معارف، فروری، ۱۹۳۰ء ص ۱۵۵، ۱۵۶۔

(۱۹) معارف، فروری، ۱۹۳۰ء، ص ۱۵۶۔ (۲۰) بحوالہ معارف، مارچ ۱۹۳۰ء، ص ۲۱۴۔

(۲۱) معارف، مارچ ۱۹۳۰ء، ص ۲۱۴، ۲۱۵۔

(۲۲) معارف، مارچ ۱۹۳۰ء، ص ۲۳۸۔

(۲۳) ایضاً۔

(۲۴) معارف، جون، ۱۹۲۰ء، ص ۴۱۰، ۴۱۱۔

(۲۵) معارف، جون ۱۹۲۰ء، ص ۴۱۳۔

(۲۶) معارف، مئی ۱۹۲۸ء، ص ۳۶۰۔

(۲۷) معارف، مئی ۱۹۲۸ء، ص ۳۶۹۔

(۲۸) معارف، مئی ۱۹۲۸ء ص ۳۷۳۔

(۲۹) معارف، مئی ۱۹۲۸ء، ص ۳۷۳۔

(۳۰) ہمارا خیال ہے کہ یہ مصرعہ ساقط الوزن ہے جس کی طرف ہاشمی صاحب نے کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔

(۳۱) معارف، مارچ ۱۹۴۵ء ص ۱۶۱۔

(۳۲) معارف، اپریل ۱۹۴۵ء ص ۸۷۔

(۳۳) معارف، اپریل ۱۹۴۵ء، ص ۹۲۔

(۳۴) معارف، اپریل ۱۹۴۵ء، ص ۹۲۔

(۳۵) (۳۶) یہ سارے کے سارے اشعار مرزا صاحب کے ہم عصر اور باکمال شاعر مولانا اقبال سہیل صاحب مرحوم کے انتخاب میں موجود ہیں، جن کی سخن فہمی کے مرزا صاحب دل و جان سے قائل تھے، اس کا تفصیلی ذکر انھوں نے اپنے مقالے ''اقبال سہیل میری نظر میں'' کیا ہے، ان اشعار کے لئے ملاحظہ ہو نقوش فانی، کبیر احمد جائسی، ص ۱۱۴، ۱۱۱۔

(۳۷)(۳۸)(۳۹)(۴۰) یہ اشعار بھی مولانا اقبال کے پسندیدہ ہیں، ملاحظہ ہو نقوش فانی، کبیر احمد جائسی، ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ، ۱۹۵۸ء، ص ۸۸، ۹۲، ۱۰۷۔

(۴۱) معارف، مئی ۱۹۴۵ء، ص ۱۱۸۔

(۴۲)(۴۳)(۴۴)(۴۵)(۴۶) یہ اشعار بھی مولانا اقبال سہیل کے پسندیدہ اشعار ہیں ملاحظہ ہو نقوش فانی، کبیر احمد جائسی، ص۹۰ تا ۱۲۵۔ (۴۷)- عارف، مئی ۱۹۵۲ء، ص۳۲۲، ۳۲۳۔

(۴۸) معارف، اپریل ۱۹۵۹ء، ص۲۴۲، ۲۴۳۔

(۴۹) معارف، اپریل ۱۹۵۹ء، ص۲۴۳۔

(۵۰) معارف، اپریل ۱۹۵۹ء ص۲۴۴۔

(۵۱) معارف، مئی ۱۹۶۵ء، ص۳۲۲، ۳۲۳۔

(۵۲) معارف، مئی ۱۹۶۵ء، ص۳۲۳۔

(۵۳) معارف، اگست ۱۹۷۴ء، ص۸۳، ۸۴۔

(۵۴) معارف، اگست ۱۹۷۴ء، ص۴۷۔

(۵۵) معارف، مارچ ۱۹۵۹ء، ص۲۳۴۔

(۵۶) معارف، جنوری ۱۹۶۵ء ص۶۹۔

(۵۷) معارف، فروری ۱۹۶۵ء، ص۱۴۹، ۱۵۰۔

(۵۸) معارف، جنوری ۱۹۷۱ء، ص۶۸۔

(۵۹) معارف، جنوری ۱۹۷۱ء، ص۶۹، ۷۰۔

(۶۰) معارف، مئی ۱۹۵۲ء، ص۳۴۲ تا ۳۴۳۔

(۶۱) معارف، مئی ۱۹۵۲ء ص۳۴۷۔

(۶۲) معارف، جنوری ۱۹۵۹ء، ص۵۶۔

(۶۳) معارف، جنوری ۱۹۵۹ء، ص۶۴۔

(۶۴) معارف، اکتوبر ۱۹۸۱ء، ص۳۴۳۔

(۶۵) معارف، جنوری ۱۹۸۳ء، ص۴۔

(۶۶) معارف، فروری ۱۹۸۳ء، ص۸۲۔

(۶۷) معارف، مئی ۱۹۷۸ء، ص۳۸۷۔

(۶۸) معارف، مئی ۱۹۷۸ء، ص۳۸۸، ۳۸۹۔

(۶۹) معارف، جولائی ۱۹۸۱ء، ص ۶۷۔

(۷۰) معارف، جولائی ۱۹۸۱ء، ص ۶۸۔

(۷۱) معارف، جون ۱۹۸۰ء، ص ۴۵۶۔

(۷۲) معارف، جون ۱۹۸۰ء، ص ۴۶۳۔

(۷۳) معارف، جون ۱۹۸۰ء، ص ۴۶۳، ۴۶۴۔

(۷۴) معارف، جون ۱۹۸۰ء، ص ۴۷۲۔

(۷۵) معارف، اپریل ۱۹۸۴ء، ص ۳۱۱، ۳۱۲۔

(۷۶) معارف، دسمبر ۱۹۸۴ء، ص ۴۲۲۔

(۷۷) معارف، دسمبر ۱۹۸۴ء، ص ۴۲۳، ۴۲۴۔

(۷۸) ملاحظہ ہو دیباچہ مقالات احسان، مرزا احسان احمد بیگ، مطبع معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۶۸ء، ص ۲۔

(۷۹) معارف، دسمبر ۱۹۸۴ء، ص ۴۲۶۔

(۸۰) معارف، دسمبر ۱۹۸۴ء، ص ۴۲۷۔

(۸۱) معارف، دسمبر ۱۹۸۴ء، ص ۴۲۷۔

(۸۲) ایضاً، ص ۴۳۷۔

☆☆☆

کتابیات

(۱) آب حیات، مولانا محمد حسین آزاد، رام نرائن لال 'بینی مادھو' الٰہ آباد، ۱۹۷۶ء

(۲) احتشام حسین اور جدید اردو تنقید، مرتبہ: پروفیسر فضل امام رضوی، سرسوتی آفسیٹ پریس، الٰہ آباد، ۲۰۰۰ء

(۳) ادبی اشارے، ڈاکٹر سلام سندیلوی، نسیم بک ڈپو لکھنؤ، اپریل ۱۹۶۹ء

(۴) اردو تنقید پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، دائرۂ ادب، پٹنہ ۱۹۸۳ء

(۵) اردو شاعری پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، ایوان اردو، پٹنہ، تیسرا ایڈیشن، ۱۹۶۶ء

(۶) اردو تنقید نگاری، مرتبہ: ڈاکٹر عبادت بریلوی، چمن بکڈپو، اردو بازار، دہلی، سنہ اشاعت درج نہیں ہے

(۷) اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر، ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی، ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ، نومبر ۱۹۶۸ء

(۸) انتخاب مضامین شبلی، تعارف رشید حسن خاں، مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۷۱ء

(۹) تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، خاتون مشرق، اردو بازار، دہلی، ۱۹۶۶ء

(۱۰) تبصرۂ حیات شبلی، محمد امین زبیری، سینٹرل انڈیا پریس، بھوپال، فروری ۱۹۴۶ء

(۱۱) تجربہ و تجزیہ، ڈاکٹر سلام سندیلوی، نسیم بکڈپو لکھنؤ، باردوم، جنوری ۱۹۸۳ء

(۱۲) تذکرہ شمس العلماء مولانا شبلی مرحوم، مرتبہ: محمد مہدی، شمسی مشین پریس آگرہ، دسمبر ۱۹۲۵ء

(۱۳) تنقیدی سرمایہ، عبدالشکور ایم اے، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علیگڑھ، سنہ اشاعت درج نہیں ہے،

(۱۴) تنقیدی اشارے، پروفیسر آل احمد سرور، ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۵۵ء

(۱۵) تنقیدی مطالعے، پروفیسر انور سیوانی، نظامی پریس لکھنؤ، پہلی اشاعت ستمبر ۱۹۶۷ء

(۱۶) تنقیدیں، پروفیسر خورشید الاسلام، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۷۷ء

(۱۷) جانچ اور پرکھ، سردار احمد جعفری، مطبع لیتھو برقی پریس، کانپور، پہلا ایڈیشن، اگست ۱۹۸۴ء

(۱۸) چند ارباب کمال، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، مطبع معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء

(۱۹) حیات جاوید، الطاف حسین حالی، ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۹ء

(۲۰) حیات سلیمان، شاہ معین الدین احمد ندوی، مطبع معارف پریس، اعظم گڑھ ۱۹۷۳ء

(۲۱) حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، مطبع معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۸۳ء

(۲۲) حیات عبدالحیؒ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، نامی پریس لکھنؤ، نومبر ۱۹۷۰ء

(۲۳) خطبات شبلی، باہتمام مولانا مسعود علی ندوی، معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۴۱ء

(۲۴) دارالمصنفین کی ادبی خدمات، ڈاکٹر خورشید نعمانی، مطبوعہ رحیمی پریس بمبئی، اکتوبر ۱۹۷۷ء

(۲۵) دستاویز، اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ، پہلا ایڈیشن ۱۹۸۳ء

(۲۶) ذکر شبلی، محمد امین زبیری، ادبی پریس لکھنؤ، پہلی اشاعت ۱۹۴۶ء

(۲۷) روایت وبغاوت، سید احتشام حسین، ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ، طبع چہارم ۱۹۷۸ء

(۲۸) سات تحریریں، عبدالقوی دسنوی، پرنٹر نظامی پریس لکھنؤ، بار اول، اگست ۱۹۷۵ء

(۲۹) سرسید اور ان کے نامور رفقاء، ڈاکٹر سید عبداللہ، چمن بک ڈپو، مٹیا محل دہلی، ۱۹۶۰ء

(۳۰) سرسید اور ہندوستانی مسلمان، ڈاکٹر نورالحسن نقوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، پہلا ایڈیشن ۱۹۷۹ء

(۳۱) سرسید احمد خاں اور ان کا عہد، پروفیسر ثریا حسین، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۲۰۰۶ء

(۳۲) شبلی کی حیات معاشقہ، وحید قریشی، مکتبہ جدید لاہور، بار اول ۱۹۵۰ء

(۳۳) شبلی نقادوں کی نظر میں، مرتبہ: محمد واصل عثمانی، صفیہ اکیڈمی کراچی، بار اول، اکتوبر ۱۹۶۷ء

(۳۴) شبلی نقادوں کی نظر میں مرتبہ: ناز صدیقی، الیاس ٹریڈرس شاہ علی بندۂ حیدر آباد، بار اول ۱۹۷۶ء

(۳۵) عود ہندی، مرزا غالب، پبلشر رام نرائن لال الہ آباد، ۱۹۲۸ء

(۳۶) غالب اور ہماری تحریک آزادی، شمیم طارق، غزالی ٹائپ سیٹرس اینڈ پرنٹرس بمبئی ۲۰۰۷ء

(۳۷) غالب مدح وقدح کی روشنی میں (حصہ اول) سید صباح الدین عبدالرحمٰن، معارف پریس اعظم گڑھ، طبع اول ۱۹۷۷ء

(۳۸) غالب مدح وقدح کی روشنی میں، (حصہ دوم) سید صباح الدین عبدالرحمٰن، معارف پریس اعظم گڑھ، طبع اول ۱۹۷۷ء

(۳۹) مقالات شبلی جلد اول، مرتبہ: سید سلیمان ندوی، معارف پریس اعظم گرھ، طبع دوم، ۱۹۹۹ء

(۴۰) مقالات شبلی جلد دوم، مرتبہ: سید سلیمان ندوی، معارف پریس اعظم گڑھ، طبع دوم، ۱۹۵۰ء

(۴۱) مقالات شبلی جلد سوم، مرتبہ: سید سلیمان ندوی، معارف پریس اعظم گڑھ، طبع دوم، ۱۹۵۰ء

(۴۲) مقالات شبلی جلد چہارم، مرتبہ: سید سلیمان ندوی، معارف پریس اعظم گڑھ، طبع دوم، ۱۹۵۶ء

(۴۳) مقالات شبلی جلد پنجم، مرتبہ: سید سلیمان ندوی، معارف پریس اعظم گڑھ، طبع دوم، ۱۹۵۰ء

(۴۴) مقالات شبلی جلد ششم، مرتبہ: سید سلیمان ندوی، معارف پریس اعظم گڑھ، طبع دوم، ۱۹۵۰ء

(۴۵) مقالات شبلی جلد ہفتم، مرتبہ: سید سلیمان ندوی، معارف پریس اعظم گڑھ، طبع دوم، ۱۹۵۰ء

(۴۶) مقالات شبلی جلد ہشتم، مرتبہ: سید سلیمان ندوی، معارف پریس اعظم گڑھ، طبع دوم، ۱۹۵۰ء

(۴۷) مقالات احسان، مرزا احسان احمد بیگ، معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۶۸ء

(۴۸) کلیات شبلی (اردو)، مرتبہ: سلیمان ندوی، معارف پریس، اعظم گڑھ ۱۹۸۱ء

(۴۹) گل رعنا، حکیم مولانا سید عبدالحیؒ، معارف پریس، اعظم گڑھ، طبع چہارم، ۱۹۷۰ء

(۵۰) مکاتیب شبلی (حصہ اول)، مرتبہ: سید سلیمان ندوی، معارف پریس، اعظم گڑھ ۱۹۶۶ء

(۵۱) مکاتیب شبلی (حصہ دوم)، مرتبہ: سید سلیمان ندوی، معارف پریس، اعظم گڑھ ۱۹۷۱ء

(۵۲) میں ہم اور ادب، ابن فرید، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۷۷ء

(۵۳) مکتوبات سلیمانی (جلد دوم)، مرتبہ: عبدالماجد دریابادی، ناشر صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ، ۱۹۶۷ء

(۵۴) مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، عبداللطیف اعظمی، مطبع مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن، ۱۹۴۵ء

(۵۵) میر امن سے عبدالحق تک، ڈاکٹر سید عبداللہ، مطبوعہ نعمانی پریس دہلی، اپریل ۱۹۶۵ء

(۵۶) نظم آزاد، مولانا محمد حسین آزاد، مطبع کریمی لاہور، بار سوم ۱۹۲۶ء

(۵۷) نقوش سلیمانی، سید سلیمان ندوی، معارف پریس، اعظم گڑھ، طبع سوم ۱۹۸۰ء

(۵۸) نقوش فانی، کبیر احمد جائسی، ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ، جنوری ۱۹۵۸ء

(۵۹) نیرنگ نظر، مرتبہ: ابن فرید، مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ ۱۹۶۰ء

(۶۰) ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں، سید عابد حسین، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۶۴ء

(۶۱) یادگار سلیمان، مرتبہ: پروفیسر عبدالقوی دسنوی، ناشر بہار اردو اکادمی، پٹنہ، دسمبر ۱۹۸۴ء

☆☆☆

رسائل

(۱) الاصلاح، سرائے میر، مرتبہ: امین احسن اصلاحی، نومبر ۱۹۳۶ء

(۲) البصیر (شبلی نمبر) پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور، ۱۹۵۷ء

(۳) الرشاد، اعظم گڑھ، مرتبہ: مولانا مجیب اللہ ندوی، جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۸۵ء

(۴) الہلال، کلکتہ، ۱۱ر فروری ۱۹۱۴ء

(۵) تہذیب الاخلاق، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۹۵ء

(۶) شبلی کالج میگزین (مولانا عبدالسلام ندوی کی یاد میں) مرتبہ: کبیر احمد جائسی، مطبوعہ شبلی ڈگری کالج اعظم گڑھ ۱۹۵۸ء

(۷) فکر ونظر (پہلا کارواں نامورانِ علی گڑھ) مرتبہ: ڈاکٹر نور الحسن نقوی، ادارۂ فکر ونظر، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جنوری تا ستمبر، ۱۹۸۵ء

(۸) معارف (سلیمان نمبر) مئی ۱۹۵۵ء

(۹) معارف، اپریل، مئی، جون ۱۹۲۰ء، جنوری، فروری، اپریل، مئی، جون ۱۹۲۸ء، جنوری، فروری، مارچ، اپریل ۱۹۳۰ء، مارچ، اپریل، مئی ۱۹۴۵ء، جنوری ۱۹۴۶ء، مئی ۱۹۵۲ء، جنوری، مارچ، اپریل ۱۹۵۹ء، جنوری، فروری، مئی ۱۹۶۵ء، جنوری ۱۹۷۱ء، اگست ۱۹۷۴ء، مئی ۱۹۷۸ء، جون ۱۹۸۰ء، جون، جولائی، اکتوبر ۱۹۸۱ء، جنوری، فروری ۱۹۸۳ء، اپریل، دسمبر ۱۹۸۴ء،

(۱۰) نقوش لاہور (مکاتیب نمبر) مرتبہ: محمد طفیل، ادارۂ فروغ اردو لاہور ۱۹۵۷ء